ہجر و وصال

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس
۱۵۶۱ گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی ۱۱۰۰۰۲

بار اوّل — مئی ۱۹۸۹ء

تعداد — ایک ہزار

باہتمام — محمد اقبال

قیمت — پندرہ ۱۵/ روپے

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۵۶۱ گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی ۲-۱۱۰۰۰

پیش لفظ

امام الہند مولنا ابوالکلام آزاد نے تبلیغ حق کے لئے اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار جلد ہی بند کر دیا گیا۔

چند دن پیشتر چودھری محمد حسین صاحب نے مجھے یہ حکم دیا کہ میں مولنا کے ان رسائل کو کہیں تلاش کروں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جن اصحاب کے پاس ادب کا یہ گنج گرانمایہ موجود تھا۔ انہوں نے اسے مطالعہ کے لئے بھی نہ دیا۔ تلاش کرتے کرتے قصور کے سید طیب شاہ صاحب کے پاس اس کا کچھ سراغ ملا۔ ان کے پاس صرف "البلاغ" کے پرچے تھے۔ شاہ صاحب چونکہ درویش منش اور فیاض انسان تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ پرچے مجھے عطا کر دیئے۔

برادر محترم خواجہ بدرالسلام فروغی ازل سے ہی وہ قلب سعید لے کر

مولانا آزاد کی اہم تصانیف

نگارشاتِ آزاد ۲۵/-
توحید و شہادت ۱۰/-
طریقۂ حج ۷/۵۰
صدائے حق ۷/۵۰
جامع الشّواہد ۱۰/-
ولادتِ نبوی ۹/-
شہادتِ حسینؓ ۷/۵۰
حضرت یوسفؑ ۷/۵۰
قولِ فیصل ۱۰/-
عزیمت دعوت ۱۰/-
حقیقت الصّلوٰۃ ۸/-
حقیقت الزکوٰۃ ۵/-
طنزیاتِ آزاد ۱۵/-

قرآن کا قانون عروج و زوال ۱۰/-
مولانا آزاد کی تقریریں ۲۵/-
اسلام کا نظریۂ جنگ ۱۵/-
انسانیت موت کے دروازے پر ۲۲/-
مسلمان عورت ۲۰/-
اُم الکتاب ۴۰/-
انتخاب الہلال ۳۵/-
مسئلۂ خلافت ۲۵/-
تبرکاتِ آزاد ۳۰/-
اصحابِ کہف ۸/-

افسانۂ ہجر و وصال

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

کیا دنیا میں جس طرح بہار و خزاں کے موسم آتے، ربیع و خریف کی ہوائیں چلتیں، اور جاڑے اور گرمیوں کا سورج بدلتا ہے، اسی طرح دلوں کی شورشوں کا بھی کوئی موسم ہے؟ روحوں کی بے قراری کی بھی کوئی فصل ہے؟ سرا سیمگی کا بھی کوئی وقت ہے، جس کی ہوائیں چلتی ہیں اور جن کے بادل نمودار ہوتے ہیں؟ میں نہیں جانتا کہ ایسا ہو۔ مگر میں پاتا ہوں کہ میرے دل کی دیوانگی ٹھہر ٹھہر کے اٹھتی اور میرے روح کی شورش گذر گذر کے لوٹتی ہے۔
میں کچھ عرصے سے اس دریا کی مانند جو اُتر گیا ہو، چُپ تھا، لیکن اس

آتے ہیں۔ جو ہمیشہ اپنی قوم کی اصلاح کے لئے مضطرب رہتا ہے۔ انھوں نے ادبی طور پر قوم کی اتنی خدمت کی ہے کہ بقول ڈاکٹر زدر کوئی حکومت کبھی اتنا نہیں کرسکتی وہ ایک نفاست پسند پبلیشر ہی نہیں، ایک بلند کردار اور عمدہ اخلاق کے انسان ہونے کے لئے وہ ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب بھی ہیں۔

فنی کتب کے علاوہ انھوں نے "جمالِ زندگی" کے نام سے ایک بیش قیمت ادبی وعلمی کتاب عوام کے سامنے پیش کی ہے۔ جس کا مقصد قوم سے اخلاقی خامیوں کو دور کرنا ہے۔ انہوں نے جب یہ البلاغ و الہلال کے پرچے میرے پاس دیکھے تو امام الہند کا پیام دوبارہ قوم کے سامنے رکھنے کے عزم کا اظہار فرمایا۔

امام الہند کی تحریر اور میرے جیسا کم مایہ انسان اسے ترتیب دے مگر اُن کے ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ چنانچہ مولانا کے سدا سرسبز وشاداب رہنے والے گلشنِ ادب سے یہ چند پھول پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

بشیر احمد

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی نیند اگر موت کی نیند نہ ہو تو کبھی نہ کبھی ضرور ختم ہو جاتی ہے۔ اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ سونے والا کبھی نہ جاگے۔ پھر بعض کی نیند ایسی ہوتی ہے کہ اک ذرا سی آواز ان کو جگا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بعض کی اس سے سخت ہوتی ہے تو ان کے لئے چیخنے اور شور مچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اُن سے بھی زیادہ غفلت کی نیند سونے والے ہوتے ہیں تو اُن کو جھنجھوڑنے اور ہلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر سونے والے کے جاگ اٹھنے کے لئے یہ بھی بیکار ہے، تو پھر ایسے لوگ بھی کبھی نہیں ہو سکتے کہ بھونچال آ جائے، آتش فشاں پہاڑ پھٹتا کبھی، پہاڑوں سے ٹکرا کے دھماکوں سے کان کے پردے ریزہ ریزہ ہو جائیں اور پھر بھی نیند کے متوالے آنکھیں نہ کھولیں۔

سو یقین کرو کہ خدا کا بھی اپنے بندوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اس کی صدائیں، اُٹھتی ہیں تا کہ غفلت کے سرشار آنکھیں کھولیں۔ اگر اس پر بھی وہ کروٹ نہیں بدلتے، تو ہر طرف شور و غل مچنے لگتا ہے کہ سونے والوں کی نیند ٹوٹے۔ اگر اس پر بھی نیند نہیں ٹوٹتی تو ہاتھ بڑھا دیے جاتے ہیں اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اٹھاتے ہیں کہ صبح آگئی اور آفتاب کی کرنیں دریچوں سے اتر کر صحنوں اور میدانوں میں پھیل گئیں۔ اب بھی اٹھ جاؤ اور اب بھی اس دن کو اپنے ہاتھ سے نہ کھو دو جو جا کر پھر واپس نہیں آئے گا۔ لیکن، آہ! اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس جھنجھوڑنے پر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں اور نیند کے متوالے کروٹ نہیں بدلتے تو پھر دھماکے ہوتے ہیں، زلزلے آتے ہیں، بستیاں

سمندر کی مانند جس کی تہ سے موجیں جوش مار رہی ہوں، پھر آہوں سے بھر گیا ہوں، فریادوں سے معمور ہو گیا ہوں، شورشوں سے لبریز ہوں، اور دلولوں کے سرجوش سے، میرا ساغرِ ضبط چھلک گیا ہے۔ آج مجھے پھر اس خاک کی تلاش ہے جس کو اپنے سرد چہرہ پر اوڑھا سکوں پھر ان کانٹوں کی جستجو ہے جن کو اپنے دل و جگر میں چبھو سکوں۔ میں دیوانوں کا متلاشی ہوں انہیں بیماری کی درستی کی ضرورت ہے۔ میں ہوشیاری سے اکتا گیا اور تندرستی نے مجھے عاجز کر دیا۔ آہ، میں چاہتا ہوں کہ جی بھر کے روؤں اور جس قدر چیخ چیخ کر نالہ و فریاد کر سکتا ہوں کرتا رہوں میری چیخیں تمہارے عیش و نشاط کو مکدر کر دیں، میرا نالہ و بکا تمہارے عیش کدوں کو ماتم کدہ بنا دے میری آہوں سے تمہارے دلوں میں ناسور پڑ جائیں، میری شورشِ غم سے تمہارے چہروں کی مسکراہٹ معدوم ہو جائے۔ میں تم کو غم و ماتم سے بھر دوں۔ میں تم کو درد حسرت کا پتلا بنا دوں تمہاری آنکھیں ندیوں کی طرح جاری ہوں تمہارا دل تنور کی طرح بھڑک اٹھے، تمہاری زبانیں دیوانوں کی طرح چیخ اٹھیں، اور تمہاری غفلت عیش اور بے دردی نشاط کی وہ بستی جو مدتوں سے برابر آباد چلی آتی ہے، اس طرح اجڑ جائے کہ پھر کبھی آباد نہ ہو۔

روئے بازار مراد امروز عرفی با نیست
دیدہ ترمی فروشم دامنِ تر میخرم!

:.:

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ آيَتٍ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ۔	اللہ کی نشانیوں میں کوئی نشانی بھی ایسی نہ آئی جس کو دیکھ کر انہوں نے عبرت پکڑی ہو اور غفلت و سرکشی سے باز آگئے ہوں۔

بلکہ بسا اوقات ایسا نظر آتا ہے کہ جس قدر عبرت کی صدائیں جگانا چاہتی ہیں اتنی ہی اس کی نیند زیادہ گہری ہوتی جاتی ہے:۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ۔ (۵۴ : ۵)	اور بلاشبہ ان کے پاس ایسی چیزیں آچکی ہیں جن میں بڑی ہی تنبیہ اور ہوشیاری ہے اور بہت ہی بڑی گہری حکمت و دانائی؛ پر افسوس کہ حوادث و انقلاب کی یہ ڈرائونی ہدایت بھی ان کی بیداری کے لئے کافی نہ ہوئی۔

دنیا میں سب سے پہلے انسان کے آگے تاریخ یعنی دنیا کے گذرے ہوئے واقعات آتے ہیں، اور ان ہی سے انسان جزبہ کی دانائی اور بصیرت حاصل کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ ہمیشہ ایک ہی طرح کے واقعات ظاہر ہوتے، ایک ہی طرح کے اعلانات کئے گئے۔ ایک ہی طرح کی حالتیں طاری ہوئیں، اور ایک ہی طرح کے نتیجے نکلے۔ پس تجربہ و استقراء اسے بتلا دیتا ہے کہ اب بھی ہمیشہ جب کبھی ویسی حالتیں پیدا ہوں گی تو ویسے ہی نتائج نکلیں گے، اور اگر آگ کے شعلوں نے ہمیشہ انسان کے جسم کو دکھ دیا ہے تو ایسا کبھی نہ ہوگا کہ آگ کے شعلوں میں کود کر کوئی ٹھنڈک پائے۔

پھٹنے لگتی ہیں، اور صداؤں اور آوازوں کی ہولناکیوں سے تمام دنیا بھر جاتی ہے۔ سو یہ بھی سب کچھ اسی لئے ہوتا ہے تاکہ کسی طرح انسان جاگے اور اب بھی آنکھیں کھول دے، اگر اس پر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں تو پھر خدا کا فرشتہ پکار اٹھتا ہے کہ :-

اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ ! وَلَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ۔

یہ زندوں کی آبادی نہیں بلکہ مردوں کی بستی ہے۔ وہ اٹھنے اور اٹھائے جانے کی گھڑی سے بالکل غافل پڑے ہیں۔

÷

پس تنبیہ اور ہوشیاری کی تمام تدبیریں ہو چکیں، اور ایک سوتے ہوتے کو جگانے کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ سب کچھ کیا جا چکا، پر افسوس کہ تمہاری آنکھیں بند ہیں، تمہاری غفلت کا نشہ کسی طرح نہیں اترتا، اور تمہاری موت کی نیند کسی طرح بھی نہیں ٹوٹتی۔ دنیا میں انسان کے لئے عقل و بصیرت ہے، عقلاء کی دانائیاں ہیں، ہادیوں کی ہدایتیں ہیں، واعظوں کے وعظ ہیں، خدا کے مقدس فرشتے ہیں، اور رسولوں کی بتلائی ہوئی تعلیمات ہیں، پھر حوادث و تغیرات ہیں، انقلابات و تبدلات ہیں، آثار و علائم ہیں، استنباط و استشہاد ہے، لیکن آہ، وہ قوم جس کی غفلت کے لئے یہ سب کچھ بیکار ہے نہ دنیا کے گزرے کے گزرے ہوئے واقعات میں اس کے لئے کوئی اثر ہے، نہ حال کے حوادث تغیرات میں اس کے لئے کوئی پیغام ہے، نہ اللہ کے کلام سے ڈرتی اور کانپتی ہے، اور نہ بندوں کی ہدایتوں سے عبرت پکڑتی ہے۔

انتہم رسلہم بالبینت فما کان اللہ لیظلمہم ولکن کانوا انفسہم یظلمون۔

دی گئیں ہیں ، ان سب کے پاس اللہ کے رسول آئے اور راہ حق کی نشانیاں انہیں دکھلائیں لیکن انہوں نے بدعملیوں کی راہ اختیار کی اور اس کی پاداش میں مٹا دیے گئے۔ سو اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا مگر ان بدبختوں نے خود ہی اپنی ہلاکت چاہی۔

اگر گذرے ہوئے واقعات و حوادث میں بھی تمہارے لئے کوئی آواز نہیں، تو پھر خود تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرنے والے حوادث و تغیرات ہیں اور ان کی زبان سب سے زیادہ چیخنے والی اور سب سے زیادہ دلوں کے اندر گھر کر جانیوالا ہے۔

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا ھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ۔

کیا نہیں دیکھتے کہ کوئی برس بھی ایسا نہیں گذرتا کہ ایک بار یا دو بار بلاؤں میں نہ ڈالے جاتے ہوں پھر بھی ان کی غفلت کا یہ حال ہے کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں اور نہ مصیبتوں سے نصیحت پکڑتے ہیں !

اور اگر وہ تمام حوادث و تغیرات جن سے تمہاری زندگی کا ہر سال اور ہر ماہ بلکہ ہر طلوع و غروب معمور تھا، تمہارے سمجھنے اور بیدار ہو جانے کے لئے کافی نہ تھے، تو آہ - کیا خدائے قدوس کی وہ سب سے آخری کڑک اور اس کے قانونِ تعذیبِ امم کی وہ سب سے کپکپا دینے والی، اور عقلوں اور ہوشوں کو مبہوت کر دینے والی گرج بھی تمہیں نہیں جگاتی، جس کا زلزلہ انگیز دھاکوں

سو اگر تمہاری نیند سونے والوں کی نیند ہوتی۔ بے روح لاش کی نیند نہ ہوتی۔ تو تمہارے جاگنے کے لئے تاریخ کی آواز بس کرتی تھی۔ تمہارے آگے نوعِ بشری کی پوری تاریخ موجود ہے، ہزاروں ملکوں اور قوموں کے تجربے موجود ہیں، ہزاروں آثار و اطلال ہیں اور زمین کے صدہا گوشے گذرے ہوتوں کی عمارتوں سے اور مٹے ہوؤں کے کھنڈروں سے رکے ہوئے ہیں، تو تم ان سب کے پاس جاؤ اور ان سب سے پوچھو، دیکھو کہ دنیا میں کوئی قوم بھی معصیت کرکے زندہ رہی ہے، اور انسانوں کا کوئی گروہ بھی خدا سے بھاگ کر بچ سکا ہے؟ کبھی ایسا ہوا ہے کہ خدا کے قانون پر چل کر قومیں تباہ ہوتی ہوں، اور اس کے قانون توڑ کر انہوں نے خوشحالی اور زندگی پائی ہے

اقوام کو چھوڑدو اور افراد کی تلاش کرو۔ جب سے زمین بنی ہے، آج تک ایک انسان بھی اس کی گود میں ایسا پلا ہے جس نے غفلت و اعراض کرکے زندگی پائی ہو، اور خدا کے قانونوں کو توڑ کر خوش حالی و مراد حاصل کی ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ تم زہر کھا رہے ہو اور امیدوار ہو کہ تمہیں زندگی ملے، اور تم نے شیروں کے بھٹ کی راہ اختیار کی ہے اور سمجھتے ہو کہ انسانوں کی آبادی میں تم پہنچ جاؤگے؟

الم یاتہم نبأ الذین من قبلہم قوم نوح وعاد وثمود وقوم ابراھیم واصحٰب مدین والمؤتفکٰت؟

کیا انہوں نے ان لوگوں کا حال نہیں سنا جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں، مثلاً قوم نوحؑ عاد، ثمود قوم ابراہیمؑ اصحاب مدین، اور وہ لوگ جن کی بستیاں الٹ

فَقَدْ جَاءَ اَشْرَاطُهَا فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ؟

ہو۔ سو اگر اسی کا انتظار ہے تو اس کی نشانیاں تو آچکیں۔ اور جب وہ گھڑی خود آجائے گی تو اس وقت ان کے لئے کیا ہوگا؟

آفتاب کو ہمیشہ اس کی کرنوں میں دیکھا جاتا ہے اور دھوئیں کو دیکھ کر مسافر پالیتا ہے کہ آگ جل رہی ہے۔ اسی طرح خدا کا جلال بھی ہمیشہ اپنی نشانیوں اور آیتوں کے اندر سے دیکھا گیا ہے۔ اور ہمیشہ اُس نے آفتاب جمال کی چمک دھوئیں کے نقاب میں دکھلائی ہے۔ پس وہ جو ہمیشہ آیا کرتا اور جس نے ہمیشہ ... انسان کو ماننے اور قبول کرنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ آج بھی آگیا۔ اور آنکھیں رکھنے والوں کے لئے اس نے اپنے چہرے پر سے اچانک نقاب الٹ دی۔ پھر اگر اب بھی تم نہیں دیکھتے اور اب بھی تم اس کے آگے جھکنے کے لئے نہیں گر جاتے، تو شاید تم منتظر ہو کہ وہ انسانوں کی طرح تمہارے سامنے آکر کھڑا ہو جائے، اور سورج کی کرنوں کے تخت پر بیٹھ کر آسمان سے اس طرح اتر پڑے کہ تم اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر اس کو چھو ؤ، اور اپنے کانوں کو اس کے منہ سے لگا دو تاکہ وہ آوازوں اور حرفوں کے اندر بول دے کہ میں خداوند قہار ہوں۔ اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوں، اسی طرح اب بھی موجود ہوں۔ مجھے مان لو اور مجھ سے انکار نہ کرو۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا

اور ان لوگوں نے کہ خدا کے لقاء کی ... نہیں رکھتے کہا: اگر جو کچھ تم کہتے ہو سچ ہے

سے پہاڑوں کی چوٹیاں ہل گئیں، اور قریب ہے کہ زمین دھنس جاتے اور سمندروں سے مچھلیاں رونے اور ماتم کرنے کے لئے ابھر آئیں؟

كَلَّا وَالْقَمَرِ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۔

(۳۷ ، ۷۴)

بیشک، چاند جب کہ نکل آیا، رات جبکہ ختم ہوگئی، اور دن جب کہ روشن ہوگیا کیا یہ حادثہ بڑے بڑے انقلابات میں سے ایک بڑا ہی انقلاب ہے اور غافل انسانوں غفلتوں کے پاداش سے سخت ڈرانے والا ہے۔ تو تم میں جو بڑھنا چاہے اس کے لئے اب بڑھنا ہے اور پیچھے ہٹنا چاہے اسکے لئے غافل رہ کر تباہ ہونا!

پھر اگر تم اس لئے نہیں اٹھتے تھے کہ جب تک زلزلے نہ آئیں گے نہیں اٹھو گے، اور جب تک آتش فشاں پہاڑ نہیں پھٹیں گے، آنکھ نہیں کھولو گے اور جب تک پہاڑوں کی چوٹیوں اور سمندروں کی موجوں کے اندر سے چیخ نہیں اٹھے گی، کانوں کو نہیں کھولو گے۔ تو آہ، یہ کیا ہے کہ زلزلے بھی آچکے اور تم نے کروٹ نہ بدلی؟ آتش فشانیوں کی ہولناکیوں سے زمین چیخ اٹھی اس پر بھی تم باخبر نہ ہوئے۔ اور اب کس بات کے منتظر ہو، اور کیا چاہتے ہو کہ آسمان پھٹ جائے اور آفتاب کے پرزے پرزے ہو جائیں اور کرۂ ارضی دھواں بن کر اڑ جائے؟

فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَن تَأْتِيَهُم بَغْتَةً؟

پھر کیا یہ لوگ، آخری فیصلہ کر دینے والی گھڑی کے منتظر ہیں کہ اچانک ان پر نازل

سنائی دیتی ہیں، اور وہ تمام فکریں اور عبرتیں ڈوب گئی ہیں جن سے دل تڑپتے
اور روحیں بے قرار ہوتی ہیں۔ پس جو کچھ کیا جاتے لاحاصل ہے، اور جو کچھ کہا
جاتے بے کار ہے۔ آہ، تم غافل ہو گئے ہو، تم پر موت کا پنجہ چل گیا ہے تم گمراہی
کے قبضے میں آگئے، تمہارے احساس فنا ہو گئے۔ اور تمہارے دل کی دانائی مٹ
دی گئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایسا تھا کہ
اندھے بینا ہو جاتے۔ لنگڑے چلنے لگتے۔ گونگوں کی چیخ سے دنیا ہل جاتی اور
لوگوں کے ہاتھ شیروں کے پنجوں کی طرح طاقتور ہو جاتے۔ آہ، تمہاری غفلت
سے بڑھ کر آج تک دنیا میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمہاری نیند کی
سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ آہ، تم ایسے نہ تھے، پھر تم ان لوگوں
کی طرح کیوں ہو گئے جن کے لئے خدا کا رسول ماتم کرتا تھا:

لهم قلوب لا يفقهون	ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں، ان کے
بها ولهم اعين لا يبصرون	پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے
بها ولهم آذان لا يسمعون	پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں، وہ مثل چار
بها اولئك كالانعام بل هم	پایوں کے ہو گئے بلکہ ان سے بھی بدتر، اور
اضل اولئك هم الغفلون	یہی ہیں کہ غفلت میں ڈوب گئے ہیں:

(۷: ۱۷۸)

آہ کوئی نہیں، سب گمراہ ہو گئے، سب بھٹکے بھٹکے سب غافل ہو گئے اور
پر نیند کی موت چھا گئی، سب نے ایک ہی طرح کی ہلاکت پی لی، سب ایک ہی

الْمَلٰٓئِكَةُ، اَوْ نَرٰى رَبَّنَا (۲۵ : ۲۱) ⊙ — تو کیوں نہیں ہم پر فرشتے اتارے گئے اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ ہمارا پروردگار آسمان سے اتر آتا اور ہم اُسے دیکھ لیتے؟

سو اگر واقعی اسی کے منتظر ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا انتظار کبھی ختم نہ ہوگا، یہاں تک کہ خدا کی جگہ اس کا آخری عذاب اترے گا اور تم کو دردناکیوں اور سوختنیوں کی بشارت دے گا۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۵ : ۲۲) — جس دن اللہ کے فرشتے نظر آئیں گے تو اس دن مجرموں کے لئے کوئی بشارت نہ ہوگی کہ وہ صالحوں کی طرح اس کا انتظار کریں۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے اور ہمیشہ اس دن کے منتظر رہنے والوں نے اپنے انتظار کا ایسا ہی جواب پایا ہے:۔

فهل ينظرون الا مثل ايام الذين خلوا من قبلهم قل فانتظروا انى معكم من المنتظرين (۱۰ : ۱۰۲) — پس کیا یہ لوگ کبھی ویسے ہی دنوں کے منتظر ہیں جیسے ان سے پہلے قوموں پر آ چکے ہیں؟ اگر ایسا ہی ہے تو کہہ دو کہ اچھا انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں!۔

آنکھیں دیکھنے کے لئے ہیں، کان سننے کے لئے ہیں، اور دل پہلو میں رکھا گیا ہے تاکہ تڑپے اور بیقرار ہو۔ لیکن وہ سب کچھ تمہارے لئے بے کار ہے۔ جن کو آنکھ دیکھتی ہے، اور وہ سب آوازیں بے اثر ہو گئی ہیں جو کانوں سے

آہ میں کیا کروں۔ اور کہاں جاؤں۔ اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں، اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں، اور تمہاری غفلت مر جائے۔ یہ کیا ہو گیا ہے کہ تم پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو، اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو۔ اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو پر نہ تو راست بازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گمراہیوں کے نقش قدم کو چھوڑتے ہو۔

افلا یتدبرون القرآن	کیا یہ لوگ قرآن کی آیتوں پر غور نہیں کرتے
ام علیٰ قلوب اقفالھا	یا ایسا ہوا ہے کہ ان کے دلوں پر قفل چڑھ
(۴۷:۲۵)	گئے ہیں؟

کیا تم وہ ہو جن کے لئے کہا گیا ہے کہ :۔

وجعلنا علیٰ قلوبھم	اور ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال
اکنۃ ان یفقھوہ وفی اذنھم	دئے ہیں کہ فکر کی آنکھ بیکار ہو گئی اور
وقرا (۱۷:۴۶)	ان کے کان بہرے ہو گئے ہیں!

آہ، تم کو معلوم ہے کہ خدا کا قانون کبھی ٹوٹنے والا نہیں اور اُس کی سنت اللہ کبھی انسانوں کی کسی بھیڑ کے لئے بدل نہ جائے گی۔ اس کا یہ قانون ہے کہ آگ جلاتی ہے اور زہر کھانے سے آدمی مر جاتا ہے، اور اسی طرح غفلت و معصیت ہلاکت لاتی ہے اور خدا کی نافرمانیوں سے عذاب اور دردناکیوں کا ظہور ہوتا ہے ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے، اب بھی ایسا ہی ہو رہا ہے، اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا:

طرح کی تباہیوں پر ٹوٹے سب نے خدا کو چھوڑ دیا، سب نے اس کے عشق سے
منہ موڑ لیا، سب نے اس کے رشتے کو بٹہ لگایا، سب غیروں کے ہو گئے۔
سب نے غیروں کی چوکھٹوں کی گرد چھانی، اور سب نے ایک ساتھ مل کر
گناہوں اور ناپاکیوں سے پیار کیا، آہ، سب نے عہد باندھ لیا کہ ہم ایک
ہی وقت میں خدا کی پکار سے بھاگیں گے۔ آہ، سب اس سے بھاگ گئے، سب
نے اس سے غول در غول بن کر بیوفائی کی، کوئی نہیں جو اس کے لئے روئے، کوئی
نہیں جو اس کے عشق میں آہ و نالہ کرے، اس کی محبت کی بستیاں اجڑ گئیں،
اس کے عشق اور پیار کے گھرانے مٹ گئے
اس کے گلہ کا کوئی رکھوالا نہ رہا، اور اس کے کھیتوں کی حفاظت کے
لئے کوئی آنکھ نہ جاگی، سب شیطان کے پیچھے دوڑے، سب نے ابلیس کے ساتھ
آشتی کی، اور سب نے بدکاروں کی طرح اپنی آشنائی کے لئے اسے پکارا۔ پھر
اس پر قیامت یہ ہے کہ کسی کو ندامت نہیں۔ کسی کا سر شرمندگی سے نہیں جھکتا۔
کسی کے گلے سے توبہ و انابت کی آواز نہیں نکلتی۔ کسی کی پیشانی سجدہ کے لئے
بیقرار نہیں، کوئی نہیں جو روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے دوڑ جائے اور کوئی
نہیں جو اپنی بداعمالیوں اور ہلاکتوں پر پھوٹ پھوٹ کر آہ و زاری کرے۔

ولقد اخذناهم بالعذاب فما استكانوا لربهم وما يتضرعون (۲۳: ۷۶)

ہم نے انہیں عذاب کی تکلیفوں میں مبتلا بھی کر دیا پھر بھی اپنے خدا کے آگے نہ جھکے اور ان میں شکستگی اور عاجزی پیدا نہ ہوئی۔

یاایہا الذین امنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا ویکفر عنکم سیاتکم و یغفر لکم واللہ ذو الفضل العظیم -	مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرنے والے ہو گے تو اللہ تمام دنیا میں تمہارے لئے ایک امتیاز اور سربلندی پیدا کر دے گا۔ نیز تمہاری تمام برائیوں کو دور کر دیگا اور تمہیں بخش دیگا تم ہی کے آگے کیوں نہیں جھک جاتے؟ وہ تو بڑا ہی فضل و کرم کرنے والا ہے!
(۸ : ۲۹)	

تم نے غفلت کو خوب آزما لیا، تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑوی گھونٹ چکھ لی۔ تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر لئے۔ تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس طرح ساری دنیا تم سے سرکش ہو گئی؟ اور ایک اس کے روٹھنے سے کس طرح تمام دنیا تم سے روٹھ گئی؟ پس مان جاؤ اور اب بھی باز آ جاؤ۔ گناہوں کو آزما چکے، آؤ تقویٰ و راست بازی کو بھی آزما لیں، سرکشیوں کو چکھ چکے، آؤ اطاعت کا بھی مزہ دیکھ لیں، غیروں سے رشتہ جوڑ کر تجربہ کر چکے، آؤ اسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں، ٹھوکروں اور راندگیوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا:-

افلا یتوبون الی اللہ ویستغفرونہ واللہ غفور الرحیم	پھر کیا ہے کہ اب بھی تم اللہ کے آگے نہیں جھکتے اور توبہ و استغفار نہیں کرتے حالانکہ اللہ تو بڑا ہی بخش دینے والا اور بڑا ہی رحمت فرمانا ہے۔

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ (۳۳:۶۲)	یہ اللہ کا قانون ہے جس کے مطابق تمام گذری ہوئی قوموں سے سلوک ہوا۔ اور اللہ کے قانون میں تم کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے!

⁂

پس میں آج سب کچھ چھوڑ کے تم سے ایک ہی آخری بات کہنی چاہتا ہوں اور یقین کرو کہ اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے اگر وہ اس بات کے لئے نہیں کہا جاتا تو سب کچھ بیکار ہے اور اس میں تمہارے لئے برکت و امن نہیں ہے۔ سو یاد رکھو اور ماننے کے لئے جھک جاؤ کہ تمہاری زندگی کا ہر عمل بیکار ہے اور تمہارے فکروں کی ہر فکر گمراہی و ضلالت ہے، تمہارے لئے صرف ایک ہی راہ نجات ہے اور بغیر اس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گزرو گے، اس وقت تک خدا کا قہر تم پر برستا رہے گا۔ اور تم کبھی مراد اور خوش حالی نہ پاؤ گے۔ تمہارے سفر کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو۔ اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ خدا کے آگے جھک جاؤ، اس کی سرکشی اور بغاوت چھوڑ دو، اس کے عشق اور محبت کو اس قدر پیو کہ بدمست ہو جاؤ، اور اس کے آگے اس طرح روؤ اور اس قدر تڑپو کہ اسے تم پر پیار آجائے اور وہ تمہیں پہلے کی طرح پھر اپنی گود میں اٹھالے اور سب کچھ تمہیں کو دے دے جس طرح کہ سب کچھ تمہارا اس نے بخش دیا تھا

تمکو ٹھکانے کی ضرورت نہ ہوگی؟

كلا اذا بلغت التراقى
وقيل من راق، وظن انه
الفراق والتفت الساق
بالساق الى ربك
يومئذ المساق، فلا
صدق ولا صلى ولكن
كذب وتولى۔

(۷۵ : ۲۸)

ہاں جب وہ گھڑی آئے کہ جان بدن سے کھنچ کر گردن کی
ہنسلی تک آ پہنچے اور دیکھنے والے بولیں کہ اب کون ہے کہ
اسکا علاج کرے اور جان نکلنے والا خیال کرے کہ اب کوچ کا وقت آگیا اور
اس کے درد اور بے چینی کا یہ عالم ہو کہ ایک پنڈلی
دوسری پنڈلی پر پٹکنے لگے، سو یہ وہ وقت
ہوگا کہ اللہ ہی کی طرف انسان کا کوچ ہوگا
پھر بتلاؤ کہ اس وقت اس بدبخت کا کیا
حال ہوگا جس نے نہ تو کبھی خدا کے حکم کو
مانا اور نہ

کبھی اس کے آگے عبادت کے لئے جھکا بلکہ ہمیشہ سچائیوں کو جھٹلایا اور حکموں سے منہ موڑا؟

اگر تم کو آنکھیں دی گئی تھیں تو اسی لئے تاکہ تم اس کو دیکھو اگر تم کو دل دیا گیا تھا تو اسی لئے تاکہ صرف اسی کو پیار کرو، اگر تم کو آنسو دئے گئے تھے تو اسی لئے تاکہ صرف اسی کی یاد میں بہاؤ اور اگر تمہاری پیشانی بلند کی گئی تھی تو صرف اسی لئے تاکہ اسی کے آگے جھکاؤ، پر آہ تمہاری زبانیں اس کی حمد کے زمزموں سے محروم ہو گئیں، تمہارے دل اس کی محبت کے نہ ہونے سے اجڑ گئے، تمہاری روحوں میں اس کی چاہت کی جگہ غیروں کی چاہتیں بھر گئیں، تمہارے قدم اس کی طرف بڑھنے سے بوجھل ہو گئے، اور تمہاری آنکھوں میں اس کے عشق کے درد و غم کے لئے ایک قطرۂ اشک بھی نہ رہا۔ تمہاری مسجدیں تڑپ رہی ہیں کہ

تمہارے خدا نے تمہارے ساتھ کونسی برائی کی تھی کہ تم نے اسے چھوڑ دیا اور اسے چھوڑ کر کونسی دولت و نعمت ہے جو تمہیں ہاتھ آگئی؟ خدا سے بڑھ کر وہ اور کون حسین ہے جس کے حسن نے تم کو خدا سے چھین لیا، اور اس سے بڑھ کر کس کے پاس محبت اور پیار ہے جس کی زنجیریں تمہارے پاؤں میں پڑ گئیں؟ تم غیروں کے پاس جاتے ہو تاکہ ٹھوکریں کھاؤ، پر خدا کے پاس نہیں دوڑتے تاکہ وہ تمہیں پیار کرے؟ اگر تم محبت کے بھوکے ہو تو الرحمٰن الرحیم سے بڑھ کر اور کون ہے جس کے عشق میں اسے چھوڑ رہے ہو؟ اگر تم رزق کے بھوکے ہو تو ربّ العالمین سے بڑھ کر اور کون ہے جس کے خزانوں کی لالچ نے تم کو متوالا کر دیا ہے؟ اگر تم اپنی محبت کی مزدوری مانگتے ہو، تو مالک یوم الدین سے بڑھ کر کون مل گیا ہے جو تمہیں بدلہ دے گا؟ فآہ، ثم آہ، ثم آہ علیٰ ما فرطتم فی جنب اللہ۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً ۖ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (۲۱: ۲۴)

پھر کیا ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو ان سے کہو کہ اپنی دلیل پیش کریں کہ وہ کون سی حقیقت ہے جس نے ان کی نظروں میں دوسروں کو معبود بنا دیا ہے؟

پھر کیا تم بالکل اس سے بے نیاز ہو گئے اور اب تمہیں خدا کے آگے جھکنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟ کیا تم کبھی بیمار نہ پڑو گے جب کہ طبیب مایوسی کا پیام دے گا اور عزیز و اقربا دیکھ دیکھ کر ناامیدی سے روئیں گے، اور کیا اس وقت تمہیں خدا کو پکارنے اور ہر طرف سے مایوس ہو کر اسی سے راحت اور

جانوں کو اس کی محبت سے بھی زیادہ پیارا سمجھتے ہو کہ اس کے لئے دکھ میں نہ ڈالئے، اور اگر تمہارے دلوں کی آہیں، تمہارے جگر تپیں تمہاری آنکھوں کے آنسو اب اس کے لئے نہیں رہے ہیں بلکہ دوسروں کا مال ہو گئے ہیں، تو یقین کر لے وہ بھی تمہارا محتاج نہیں ہے، اور اس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے۔ وہ اگر چاہے گا تو اپنے کلمۂ حق کی خدمت کے لئے درختوں کو چلا دے گا، پہاڑوں کو متحرک کر دے گا، کنکروں اور خاک کے ذرّوں کے اندر سے صدائیں اٹھنے لگیں گی، پر وہ فاسق اور نافرمان انسانوں سے کبھی کام نہ لے گا، اور اپنے پاک کام کی عزت کو ناپاکوں کی گندگی سے کبھی آلودہ نہ ہونے دے گا۔ اور پھر تم مانو یا نہ مانو مگر میں نے سچ مچ دیکھا کہ جب تمہارے اندر سے اس کی پکار کو جواب نہ ملا تو وہ دوسروں کو پیار اور محبت کے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا ہے!

⁂

یایها الذین امنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یاتی الله بقوم یحبهم و یحبونه اذلة علی المؤمنین اعزة علی الکفرین یجاهدون فی سبیل الله ولا یخافون لومة لائم ذلک

اے مسلمانو! تم میں سے جو شخص دین حق کی راہ سے پھر جائے گا سو اسے یقین کرنا چاہیے کہ خدا اپنے کلمۂ حق کے لئے اس کا محتاج نہیں ہے قریب ہے کہ وہ ایک قوم کو نمایاں کرے جو اللہ کو چاہنے والی ہوگی اور اللہ اسے پیار کرے گا۔ وہ مومنوں کے آگے نہایت عاجز اور نرم ہوں گے پر دشمنانِ حق کے لئے نہایت مغرور، سرکش، اللہ کی

راست بازی کی تڑپتی ہوئی مضطرب نمازیں ان کو نصیب ہوں، مگر حیوانوں اور چارپایوں کے کھڑے رہنے اور اوندھے ہو جانے کے سوا وہاں اور کچھ نہیں ہوتا۔ حالانکہ تمہارا خدا تمہارے کھڑے رہنے اور اوندھے گر پڑنے کا بھوکا نہیں، اور اگر صرف پاؤں کو کھڑا رہنا ہی عبادت ہوتا تو جنگلوں کے درختوں سے زیادہ تم کھڑے نہیں رہ سکتے فویل للمصلین الذین ھم عن صلوتھم ساھون (۱۰۷: ۴) وَاِذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی یراءون الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا (۴: ۱۴۲)

بہت ہو چکا، اب

بہت ہو چکا، اب بھی چھوڑ دو، آہ، بہت سو چکے اب بھی چونک اٹھو، بہت گم ہو چکے اب بھی اپنے کو پالو۔ خدا نے تم کو وہ مہلت دی ہے جس سے بڑھ کر آج تک زمین کی کسی مخلوق کو بھی مہلت نہ دی گئی پھر ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے۔ اور تمہارے جگہ کسی اور کو اپنی چاہتوں کی شہنشاہی اور اپنی محبت کا تاج و تخت دیدے، جیسا کہ اس نے ہمیشہ کیا ہے:-

وربک الغنی ذوالرحمۃ	اور تمہارا پروردگار بے پروا اور فیاض ہے۔
ان یشأ یذھبکم ویستخلف	اگر وہ چاہے گا تو تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے
من بعدکم ما یشاء	گا اور تمہارے بعد کسی دوسری جماعت کو کھڑا
کما انشاکم من ذریۃ	کر دے گا جس طرح کہ خود تم کو دوسروں میں سے
قوم اخرین۔	اس نے منتخب کیا تھا!

اگر تم کو اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے کہ اُسے نہ دو گے، اور اپنی

حقیقت بقائے اسلام و فنائے کفر

آج ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کی تفسیر کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کے متعلق ایک سلسلہ مضامین شروع کریں۔

یہ مسئلہ نہایت عظیم الشان ہے اور قرآن حکیم کے بکثرت بیانات و تصریحات ہیں جن کا فہم صحیح اس کے سمجھ لینے پر موقوف ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سلسلہ کی ہر صحبت ایک مستقل ہو، اور اپنے اتمام لذت و تکمیل مطالعہ میں ماسبق و ما بعد کی محتاج نہ ہو۔ وما توفیقی الا باللہ۔

بقائے حق و فنائے باطل

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی تمام تعلیمات کی

فضل اللہ یؤتیہ
من یشاء واللہ
ذو الفضل العظیم

راہ میں بے خوف جہاد کریں گے، اور کسی
الزام دینے والے کے الزام کی پروا نہ
کریں گے۔ یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے۔ جس کو
چاہے بخشے۔ وہ بڑا ہی فضل و کرم والا ہے۔

دئے ہیں، جن کو نادان و غافل انسان اس قانون کی اٹل بادشاہت پر کر بیٹھتا ہے۔

پھر اس سے بھی زیادہ یہ کہ یہ قانون قرآن حکیم اور دین الٰہی کے لئے ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جو اس کے تعلیم و ہدایت کی تمام شاخوں پر حاوی نظر آتی ہے اور جو کچھ کہا جاتا ہے اور بتلایا جاتا ہے، سب کے اندر اسی قانون الٰہی کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ قصص و واقعات ہیں تو اسی قانون کے لئے ہیں امثال و حکم ہیں تو اسی قانون کے لئے۔ احکام و نواہی ہیں تو اسی قانون کے لئے۔ السموٰات والارض کے تفکر و تدبر پر زور دیا جاتا ہے تو اسی کی غرض سے غفلت اور اعراض پر تنبیہ کی گئی ہے اسی کی خاطر۔ اور تعقل و تفقہ کا حکم دیا گیا ہے تو صرف اسی کے لئے۔ دنیا میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے، قرآن کہتا ہے کہ سب کو اسی قانون کے لئے دیکھو اور سب پر اسی کے سمجھنے کے لئے غور و فکر کرو۔ وہ کہتا ہے کہ اگر آسمان پر ہر طرف سے گھٹائیں امنڈ آتی ہیں اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے چل رہے ہیں تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس قانون کو نہیں سمجھتے؟ اگر سمندروں میں موجیں اٹھ رہی ہیں اور بڑے بڑے جہاز ان میں تنکوں کی طرح تہ و بالا ہو رہے ہیں تو تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے کہ تم قانون کو نہیں دیکھتے؟ اگر سمندروں باغوں میں پھول کھلے ہیں اور کھیت شادابی سے لہلہا اٹھے ہیں۔ یہ قرآن کہتا ہے کہ پھولوں کے اوراق میں بھی اسی قانون کو پڑھو اور کھیتوں پر سے بھی اسی لئے گذر دو تاکہ خدا کے سب سے بڑے اور سب سے پہلے قانون کو پا لو۔

ہم یہاں ان کی آیات کو نقل نہیں کریں گے کیوں کہ انہی پر آگے چل

بنیاد ایک حقیقت وقانون پر رکھی ہے۔ جس کو وہ حق کے بقاء اور باطل کے شکست وہلاکت سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ کائناتِ عالم میں ایک چیز ہے جس کا نام حق ہے۔ اس کا خاصۂ قدرتی یہ ہے کہ وہ صرف کامیابی و فتح اور بقاء ودوام کے لئے ہے۔ نقصان اور ہلاکت کبھی اس کے لئے نہیں ہوسکتی۔ اس کے بالمقابل ایک دوسری چیز ہے جس کا نام "باطل" ہے سو جس طرح پہلی چیز صرف بقاء کے لئے تھی، اسی طرح یہ صرف فناء وہلاکت کے لئے ہے۔ اس کو کبھی بھی کامیابی نہیں مل سکتی اور کبھی وہ حق پر غالب نہیں آسکتی۔ پھر جا بجا انہی دو حقیقتوں کو اور مختلف ناموں سے بھی پکارا ہے اور مختلف حالتوں میں آکر ان کی مختلف صورتیں بن گئی ہیں۔ تاہم ہر جگہ ان کے دو قدرتی خاصوں کا دعویٰ اور اعلان عام موجود ہے۔ اور اس پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ دو تہائی قرآن اسی قانون بقاء حق و فناء باطل کے ذکر سے لبریز ہے۔ کہیں صرف صاف اور سادہ دعویٰ کر دیا ہے، کہیں دلائل و شواہد پیش کئے ہیں، کہیں مثالوں کے پیرایہ میں سمجھایا ہے، کہیں حق و باطل کے مشہور معرکوں کی سرگذشتیں دہرائی ہیں، اور کہیں مختلف قوموں اور ملکوں کے قصص و واقعات سنا کر اس کی حقیقت کو ذہن نشین کیا ہے۔ کہیں اس قانون نفاذ کے آثار و علائم بتلائے ہیں۔ کہیں اس کے نتائج و ثمرات کو گنایا ہے، کہیں بتلایا ہے کہ اس کی حکومت ابتداءِ خلقت سے ہے اور آخر تک رہے گی، کہیں خبر دی ہے کہ دنیا کا ماضی اور مستقبل یکساں طور پر اس قانون کی صداقت کی شہادت ہے، اور کہیں نہایت شرح و بسط سے ان تمام شبہوں اور اعتراضوں کے جواب

اور پھر اس کے علاوہ عام طور پر انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے تمام متبعین کی زندگی کو دیکھا جاتے تو ان کا ایک ایک عمل اور یک ایک قول اسی قول کا یقین دظہور ہوگا۔ قرآن حکیم کے علاوہ جس قدر خدا کی مقدس کتابیں دنیا میں آئیں، ان سب نے بھی اسی قانون کی بادشاہت کا اعلان کیا۔ اخلاق میں آکر بھی ہم کو سچائی کی کامیابی اور باطل کی شکست کا یقین دلایا جاتا ہے، اور عام طور پر گو ایسے انسان نہ ہیں جن کو سچائی کی فتح پر سچا یقین ہو، تاہم بولتے سب ہیں کہ کامیابی حق ہی کے لئے ہے۔

پس ایک نہایت اہم اور مقدم سوال یہ ہوتا ہے کہ قرآن حکیم اور تمام مقدس نوشتوں نے اس دعوے کی حقیقت کیا ہے؟ اور حق کے بقاء و فتح اور باطل کے فناء و شکست کی حقیقت کیوں بطور ایک قانون پیش کی جاتی ہے؟ یہ کیوں سمجھے کہ حق کامیاب ہوا اور کیوں نہ سمجھ لیں کہ کامیابی باطل کے لئے ہے؟

دین الٰہی اور قرآن حکیم نے اپنے تمام دعووں کی صداقت کی بنیاد اسی قانون پر رکھی ہے۔ سچائی نے جب کبھی ظہور کیا ہے تو ہمیشہ یہی دعویٰ کیا ہے کہ کامیابی و نصرت ظاہر ہو کر بتلا دے گی کہ حق کون ہے اور باطل کس کے پاس ہے؟

یٰقوم اعملوا علیٰ مکانتکم	اے لوگو، تم اپنی جگہ کام کرو، میں بھی
انی عامل سوف تعلمون	کام کر رہا ہوں عنقریب جان جاؤ گے کہ انجام
انہ لا یفلح الظالمون	کار کس کے ہاتھ ہے۔ اللہ کبھی ظالموں کو

کر بحث کرتی ہے اور وہ نہایت کثرت سے ہیں تاہم تم قرآن کے جس حصہ پر نظر ڈالوگے اس قانون کا دعویٰ ہر جگہ نظر آئے گا:۔

وقل جاء الحق، و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ (۱۸:۱۷)	اور کہہ دے کہ حق آیا اور باطل نابود ہوا یقین کرو کہ باطل صرف نابود ہونے اور کھو جانے ہی کے لئے ہے ۔

سورۂ یونسؑ میں ہے:۔

ویحق اللہ الحق بکلماتہ ولو کرہ المجرمون (۸۲:۱۰)	اور اگر اللہ اپنی کلمات سے حق کو حق کر دکھلائے گا اگرچہ باطل پرستوں پر یہ شاق گذرے!

وہ ہر جگہ کہتا ہے:

ان اللہ سیبطلہ ان اللہ لا یصلح عمل المفسدین	اللہ باطل کو عنقریب محو کر دے گا۔ وہ فساد والوں کو کامیابی نہیں دیتا۔

حضرت یوسفؑ نے بھی یہی کہا تھا:۔

ان اللہ لا یفلح الظلمون۔	خدا ظلم والوں کو فلاح نہیں دیتا۔

اسی سلسلہ میں وہ اور زیادہ اس چیز کو واضح کرتا ہے جب کہ کہتا ہے کہ:۔

ان اللہ لا یھدی القوم الفاسقین	خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا ۔ یعنی [illegible] نہیں ملتی

کسی وجود مقصود کے ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا وجود خلقت اعلیٰ اعمالی لطافت سے
بالکل اٹی ہوئی ہے اور اس کا کوئی گوشہ خالی اور بیکار نہیں ہے اس کی مثال یوں
سمجھو کہ مکان ہے اور اس کے صدہا کمرے ہیں۔ مگر گھر کا کوئی کمرہ خالی نہیں ہے
اب جب کبھی کوئی شخص گھر کے کسی کمرہ پر قبضہ کرنا چاہے گا تو یہ نہیں ہوگا کہ وہ
اٹھا اور ایک خالی کمرہ میں بس گیا بلکہ کوشش کرنی پڑے گی کہ اس کو خالی کرائے
اور جو شخص پہلے سے اس میں موجود ہے وہ یا تو ہٹ جائے یا مٹ جائے۔
اس حالت کا قدرتی یہ نتیجہ نکلا کہ ہر وجود کے بناؤ کے لئے لازمی ہوگیا
کہ کسی دوسرے وجود پر بگاڑ طاری ہو، اور ہر طاقت کے پیدا ہونے کے لئے
ضروری ٹھہرا کہ کوئی دوسری طاقت کمزور ہو جائے۔ پس دنیا میں ہر زندگی اپنے
کو باقی رکھنا چاہتی ہے، اور باقی رہنے کے لئے جد و جہد کرتی اور اپنی راہ کو
صاف کرتی ہے۔ چونکہ ہر ہستی یہی کر رہی اور اسی کے لئے اس کی حرکت و جہد
ہے، اس لئے دنیا میں بقاء کی خواہش و طلب سے کشاکش کی ایک باہمی
جنگ قائم ہوگئی ہے۔ ان گنت قوتیں ہیں جو باہم دگر لڑ رہی ہیں، ٹکرا رہی ہیں،
ایک دوسرے کو پامال کر رہی ہیں، اور ہر قوت چاہتی ہے کہ کامیاب و فتح مند ہو۔
خود باقی رہے، دوسروں کو فنا کر دے۔ حیوانات، نباتات، جمادات بلکہ
تمام معنویات و معقولات میں بھی یہ باہمی جنگ قائم ہے، اور اس تنازع میں
چونکہ بقاء کے لئے فنا مستلزم اور تعمیر بغیر تخریب کے ہو نہیں سکتی، لہٰذا
ناقص چیز بگڑتی ہے اور سالم وجود بنتا ہے۔ ناقص جگہ خالی کرتا ہے اور
سالم قابض ہوتا ہے۔ اس حالت کا نام تنازع البقا ہے اور اسی

لا یفلح الظالمون۔ فلاح نہیں دیتا۔

پس جب تک اس قانون کی حقیقت اور سچائی کو نہ سمجھ لیا جائے اس وقت تک کوئی انسان نہ تو قرآن کو سمجھ سکتا ہے اور نہ دین حق کے ایمان و حقیقت میں اس کا کوئی حصّہ ہو سکتا ہے۔

قانون انتخاب طبیعی یا بقاء اصلح

لیکن قبل اس کے کہ اصل بحث شروع ہو، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تمام عالم وجود حیات میں "تنازع البقاء" یعنی بقاء اور زندگی کے قائم رکھنے کے لئے ایک دائمی جنگ اور مقابلہ قائم ہے، اور اسی حالت سے "انتخاب طبیعی" در "بقاء امثل و اصلح" کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ یعنی فطرت صحیح اور طاقتور کو بقاء اور زندگی کے لئے چھانٹ لیتی ہے اور کمزور و غیر صالح کو فناء کر کے چھوڑ دیتی ہے۔

دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر وجود کے اندر اس کی طلب رکھ دی ہے کہ اپنے تئیں باقی رکھے اور ہلاک ہونے سے بچائے۔ یہ بقاء کا عشق اس کی طبیعت کا خلقی عشق ہے، اور اس قدر قوی ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے صرف اس کے لئے کرتا ہے اور اس کی تمام جد و جہد حیات کا مدار یہی ہے۔

لیکن دوسری طرف کائنات ہستی کا یہ حال ہے کہ اس کا ہر گوشہ اور ہر ذرہ اپنے اندر ایک خلقت و مقصد رکھتا ہے اور اس کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بغیر

طبعی کے معنیٰ یہ ہیں کہ فطرت دنیا میں صرف طاقت و صحت اور سلامتی و موفقیت کو باقی رکھتی ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ جو وجود سب سے زیادہ طاقتور، تندرست، صحیح و سالم، اور نقص و خرابی سے پاک ہوگا وہی باقی رہے گا اور جو ایسا نہیں ہے وہ مٹا دیا جائے۔ یہی معنیٰ بقاء و اصلح کے ہیں۔ اصلح یعنی اوفق، امثل، اجود، اعدل، اسلم، اسلح، اصح اور اقویٰ۔

اب دنیا پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ دنیا کی ہر خلقت حیات وجود کے ہر گوشہ میں کس طرح قانون بقاء اصلح نافذ ہے۔ اور بغیر انقطاع و تزلزل کے کام کر رہا ہے؟

حیوانات میں سب سے پہلے خود انسان کو دیکھو۔ انفرادی حالت میں بھی جانچو اور اجتماعی حالت میں بھی مطالعہ کرو۔ انسان کا جسم طرح طرح کے اعضاء داخلی و خارجی سے مرکب ہے اور سب کے افعال ہیں۔ خواص ہیں، باہم ترکیب و امتزاج کا اعتدال ہے۔ اور پھر اس سے قوت اور ضعف، صحت اور بیماری، نقص اور سلامتی کی مختلف حالتیں اس پر طاری ہوتی رہتی ہیں۔

پس سب سے پہلے تو اس کے ہاتھ میں شکار کا برچھا، عملیات کا آلہ، جدوجہد کا متحرک ہاتھ، اور طلب نفع و سود کا ولولہ، فطری، اور ہجوم و دفاع کا بڑھتا اور گھٹتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کو باقی رکھنے اور قوی بنانے کے لئے جن جن چیزوں کا محتاج ہے ان میں سے ہر چیز کو جدوجہد کرکے حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کے بقا کے عشق میں صدہا وجودوں کو مٹا دیتا ہے۔ وہ جانوروں کو ہلاک کرتا اور ان کا گوشت کھاتا ہے۔ ان جانوروں کے مقابلہ میں وہ اصلح ہے، پس اصلح کے لئے

سے انتخاب طبیعی قانون ہمارے سامنے آتا ہے۔

اب اس کشمکش میں کامیابی اور بقاء صرف اسی کے لئے ہے جس کے اندر عدل وصحت کی وہ حالت پیدا ہو جائے جس کا نام طاقت وتندرستی ہے جس طرح جنگ میں طاقتور فریق فتح پاتا اور کمزور شکست کھاتا ہے، اسی طرح اس جنگ میں بھی طاقت اور صحت فتح پائے گی، اور ضعف اور نقص شکست کھاکر رفتہ رفتہ ہلاک ہو جائے گا۔ اسی سے قانون مدافعت پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس کشمکش میں جو وجود اپنا دفاع طاقت کے ساتھ قائم کر سکے گا اور حملہ آور سے مغلوب نہ ہو سکے گا وہی باقی رہے گا۔

یہ چیز کہ دنیا میں طاقت اور صحت باقی رہتی ہے اور ضعف ونقص فنا ہو جاتا ہے، بتلاتی ہے کہ قدرت الہٰی نے دنیا میں زندہ رہنے، باقی رہنے، نشوونما پانے اور غالب ہونے کو صرف طاقت وصحت کا خاصہ قرار دیا ہے اور اس کا یہ قانون ہے کہ وہ طاقت کو منتخب کر لیتی ہے تاکہ وہ باقی رہے اور ضعف کو چھانٹ دیتی ہے تاکہ وہ ہلاک ہو جائے، پس دراصل یہ فطرت کا قانون انتخاب ہے طاقت کو باقی رکھنے کے لئے الگ کر لینا اور ضعف کو ہلاک کے لئے جدا کر دینا اسی کا نام انتخاب طبیعی اور نیچرل سلکشن ہے۔

بقاء اصلح وامثل

اسی انتخاب طبیعی سے بقاء اصلح کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ انتخاب

اس کے دماغ کے آگے جھک جاتی ہیں اور اپنی جگہ خالی کر دیتی ہیں تاکہ طاقت والی قومیں اس پر قابض ہو جائیں۔ یہ بھی بقاء اصلح ہے اصلح نے غیر اصلح کو شکست دے دی، اور فطرت نے اقوام کو بقاء کے لئے چھانٹ لیا۔

اسی طرح عام طور پر حیوانات کو دیکھو طاقتور اور اصلح حیوانات باقی رہتے ہیں۔ ضعیف وغیر اصلح مٹ جاتے ہیں۔ یا تو وہ خود اپنی جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ضعف کا نتیجہ موت ہے۔ یا پھر ضعف کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کر سکتے اور طاقت ان کو اپنا لقمہ بنا لیتی ہے۔ شیر بکری کو کھا لیتا ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ ہوا میں اڑنے والے جانور چھوٹے کیڑوں اور بھنگوں کو ہلاک کر کے اپنی غذا بنا لیتے ہیں۔

نباتات کو دیکھو، جو درخت طاقتور ہوتا ہے اسی کو زمین اپنی گود میں جگہ دیتی ہے۔ اور جو کمزور ہوتا ہے اس کو چھانٹ دیتی ہے۔ وہ خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ ایک ہی جگہ دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ ایک بڑے تنا ور درخت کی جڑیں ہیں جو پھیلی ہوئی ہیں اور ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے درختوں کے پودے پانی دے دے کے اگائے گئے ہیں۔ فطرت بڑے درخت کو باقی رکھنے کے لئے چھانٹ لیتی ہے۔ اس کے پھیلے ہوتے ریشے زمین کی تمام رطوبت اور قوت نشو کو کھینچ لیتے ہیں اور ضعیف پودوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ وہ فنا ہو جاتے ہیں۔ تم ہزاروں درخت لگا دو اور صدہا تخم زمین میں چھڑک دو پھل وہی لائے گا اور زندگی و بقاء اسی کو ملے گی، جو اصلح ہوگا غیر اصلح کو زمین قبول نہ کرے گی اور

غیر اصلح فنا ہو جاتے اور اصلح اضعف کو مٹا دیتا ہے۔ وہ اپنے تمام اعمال حیات میں فوائد و قوی کو حاصل کرتا اور مضرت کو دور کرتا ہے۔ اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ کہ وہ باقی رہنے کے لئے اپنے کو قوی بناتا اور ضعف و اضمحلال سے بچتا ہے۔ وہ ہلاکت کے ہر عملہ کو دُور کرتا، اس کے دور کرنے کے وسائل عمل میں لاتا اور ہر نقصان پہنچانے والے اثر کو دفع کرتا ہے۔ یہ بھی وہی طلب اور بقاء اصلح بننے کی سعی ہے۔ اسی طرح اس کے تمام اعمال کو دیکھ جاؤ۔ سب کے اندر یہی چیز نظر آئے گی۔ پھر اس کے بعد دیکھو گے کہ جب انسان کے اندر ضعف پیدا ہو گیا، نقص پیدا ہو گیا، فتور آگیا، اعتدال سے انحراف ہو گیا۔ اس کے کارخانہ جسم کا کوئی پرزا ٹوٹ گیا، زنگ آلود ہو گیا، یا اور کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی جس کے بعد وہ اصلح نہ رہا اور ضعف و نقص اس پر چھا گیا، سو اس ... کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا اور باقی رہنے کے قابل نہ رہے گا، فطرت اس کو چھانٹ دے گی، کیوں کہ وہ کہتی ہے کہ میری دنیا صرف اسیع، اصلح اور اقوی کے لئے ہے۔ ناقص یہاں نہیں بس سکتا۔

پھر اجتماعی حالت میں دیکھو تو یہی قانون نظر آتا ہے۔ طاقتور گھرانے اور نسلیں ضعیف گھرانوں اور نسلوں کو مقابلے میں شکست دے دیتی ہیں قوی قومیں کمزور قوموں کو ہلاک کر دیتی ہیں۔ جس جماعت اور قوم کے پاس طاقت ہے، وہ طاقت کے قدرتی حق کا حربہ لے کر اٹھتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ خدا کی زمین میرے لئے ہے، کیوں کہ میں طاقتور ہوں۔ پس تمام کمزور قومیں

آبنوس کے درخت کی لکڑی سے کنگھی بنی اور زلفِ معشوق کی معطر لٹوں سے ہم کنار ہوتی لیکن اسی کی ہم جنس لکڑیاں تھیں جو چولھے میں جل رہی تھیں، اور اسی گھر کے چولھے میں جس کے صحن باغ میں آبنوس کے شانۂ حسین ہے۔ دستِ حسن آرائش پا رہا تھا۔ غور کرو تو یہ بھی بقاء اصلح ہے۔ اصلح نے وہی جگہ پائی جو اصلح کے لئے تھی۔ غیر اصلح کو وہی جگہ ملی جو اس کے لئے قرار دے دی گئی تھی فطرت انتخاب کرتی ہے۔

اچھا، ایک گھر گر گیا۔ اور ایک کی چھتیں استحکام و استواری کے ساتھ قائم ہیں۔ تم نے کبھی سوچا کہ یہ کیا ہے؟ کیا یہی نہیں ہے کہ جو عمارت اصلح ہے اور قوی ہے، باقی رہے گی، جو غیر اصلح ہے، فنا ہو جائے گی؟

شہروں کو دیکھو، آبادیوں کو دیکھو، زمینوں کو دیکھو، نہروں کو دیکھو کتنے ہی شہر ایک وقت میں آباد ہوتے ہیں، پھر آگے چل کر چند شہروں کی آبادی بڑھتی اور قائم رہتی ہے۔ باقی اجڑ جاتے ہیں اور انسانوں کی جگہ زاغ و زغن کا آشیانہ بنتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ قانون بقاء اصلح نافذ ہے جو آباد رہا وہ اصلح تھا۔ جو اجڑ گیا وہ اصلح نہ تھا۔

زمین ہر جگہ ایک ہی طرح کی زمین ہے مگر ہر زمین آباد نہیں۔ آباد وہی ہوتی ہے جو آبادی کے لئے اصلح ہو تم کہتے ہو کہ اس کی ہوا اچھی ہے، اس کا پانی صحیح ہے، اس کا موسم خوشگوار ہے الفاظ بہت سے ہو گئے مگر مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ یوں کہو کہ جو زمین آباد رہنے کے لئے اصلح تھی وہ آبادی جو اصلح نہ تھی آباد نہ ہوئی۔ اس کا اصلح نہ ہونا دیکھ لو چٹیل میدان ہے، جنگل ہے

وہ اپنی غیر اصلحیت سے اپنی موت کا اعلان کر دے گا۔

جمادات کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ ان کے جمود اور ٹھوس اجزاء کی وجہ سے ان کے اعمال و تغیرات کی رفتار بہت ہی دھیمی ہے اور گھڑی یا گھنٹے کی سوئی کی حرکت کی طرح تم ان کی حرکت و تغیر کو دیکھ نہیں سکتے۔

اس سے قطع نظر دنیا یا وجود اور زندگی میں سے جو کچھ ہے، سب بقاء اصلح کے ماتحت ہے۔ پھر کتنے ہی حیوانات جو زمین کی گود میں پیدا ہوتے پر اس نے انھی کو قبول کیا جو اصلح تھے کتنے ہی انواع حیوانات کی نسلیں ہیں جو مدتوں تک زمین پر چلی پھریں، مگر باقی وہی رہیں جو اصلح تھیں کتنے ہی درخت اُگے اور طرح طرح کی سرسبزیاں زمین کی سطح پر نظر آتیں مگر جن میں ضعف و نقص پیدا ہو گیا، وہ سب کے سب چھانٹ دیئے گئے اور اور جو تندرست رہے، باقی رکھے گئے۔ جنگل میں صدہا درخت کھڑے ہیں۔ جو سرسبز ہیں، پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوتے ہیں، وہی پالے جائیں گے۔ انہیں کی رکھوالی کی جائے گی۔ اور انہی کو زندہ رکھا جائے گا۔ مگر جو سوکھ گئے۔ ان کی شاخوں میں سبزیتے نہ رہے اور ان کے سائے میں راحت و آرام باقی نہ رہا۔ سو وہ کاٹ دیئے جائیں گے ان کی چولہوں میں جل کر پکاریں گی کہ دنیا میں زندگی صرف اصلح کے لئے ہے۔ غیر اصلح کو آگ اور سوختی کے سوا کچھ نہ ملے گا نظیری نیشاپوری اسی کو کہتے ہیں۔

تو نخل میوہ نشاں باش در حدیقہ دہر
کہ کم درخت تہی خشک شد کہ شکستند

صدہا علوم قائم ہوئے اور صدہا ایجادات کی گئیں، مگر انتخاب طبیعی نے ثابت کر دیا کہ جو علوم نافع تھے ان کو عروج و اشاعت نصیب ہوئی جو غیر نافع اور اصلح نہ تھے ہٹ گئے۔ نافع علوم کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکے۔ چاندی سونا بنانے کی کیمیا کا فن کتنے عرصہ سے دنیا میں پیدا ہو چکا ہے؟ اور کتنے ہی انسانوں نے اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں؟ لیکن دیکھو بقاء اصلح کے قانون نے کیا فیصلہ قطعی کر دیا؟ جوتا بنانے اور لوہاری کا فن ہزاروں برس سے برابر زندہ و قائم و روز افزوں ہے، مگر تانبے کو سونا بنانے کا فن دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔ طرح طرح کی تعلیمیں انسانوں نے دیں، طرح طرح کے قوانین بنائے، طرح طرح کے اصول اور قواعد گھڑے، مگر فطرت نے باقی رکھنے کے لئے انہی تعلیموں اور قانونوں کو چھانٹ لیا جو اصلح و احق تھے۔ کیوں کہ ان میں باہم مقابلہ ہوا۔ مقابلے میں وہی جیتا جو اصلح تھا۔ پس اصلح قانون کو انسانوں نے قبول کر لیا، غیر اصلح قوانین شکست کھا کر مٹ گئے۔

اسی طرح صدہا زبانیں قائم ہیں، کیوں کہ اصلح ہیں، اور صدہا زبانیں پیدا ہو کے اور عرصہ تک قائم رہ کر مٹ گئیں، کیوں کہ اصلح نہ تھیں۔ ایک ہی ملک میں دس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں تنازع البقاء شروع ہوتا ہے۔ آخر میں طبیعت انتخاب کرتی ہے۔ اور وہی باقی رہتی ہے۔ جو اصلح ہے۔ لوگ ہندوستان میں اردو اور ناگری کے لئے جھگڑتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اس کا فیصلہ انتخاب طبیعی کے ہاتھ میں چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔ جو بولی اصلح ہوگی وہی باقی رہے گی۔ پھر کتنی ہی کتابیں ایک ہی فن اور علم میں لکھی جاتی ہیں، اور میدان قبولیت میں تنازع البقاء شروع ہوتا ہے

اشرف المخلوقات کی جگہ سانپوں اور کیڑوں کا مسکن ہے۔

پھر یہ کہا ہے کہ ایک زمین پر کانٹے نظر آتے ہیں اور ایک پھولوں اور سرسبزیوں سے بہشت بنی ہوئی ہے؟ اس لئے کہ پہلی اصلح نہیں ہے۔ وہاں پھول نہیں اگتا، وہ مفسد ہے۔ مفسد کو حق نہیں کہ پھولوں کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔ اس کے سر پر کانٹوں کا تاج رکھا جائے گا۔ دوسری زمین اصلح ہے پس وہ دلفریب رنگتوں اور روح پرور عطر بیزیوں سے دلفریب بنائی جاتی گی اور حسن و خوبروئی کا باغ وہاں آراستہ ہوگا۔

ایک نہر کیوں سوکھ گئی؟ اصلح نہ تھی کیونکہ نہر بننے اور پانی کے جاری رہنے کی قوت اس سے چھن گئی۔ جمنا اور گنگا کیوں بہہ رہی ہیں؟ اس لئے کہ اصلح ہیں۔ غیر اصلح نالے اور نہریں سب اسی میں آکر جذب ہو جائیں گے۔

عالم معنویات اور بقاء اصلح

اب چند لمحوں کے لئے ایک اور دنیا میں آؤ۔ خیالات ہیں، افکار ہیں، علوم ہیں، ایجادات ہیں، تعلیمات ہیں، قوانین ہیں، زبانیں ہیں، اسماء ہیں، اصطلاحات ہیں، راگنیاں ہیں، ضرب الامثلین ہیں، تصنیفات اور کتب ہیں۔ اس قسم کی تمام چیزوں کو جن کا تم تصور کر سکتے ہو اپنے سامنے لاؤ اور دیکھو کہ ان سب میں بھی تنازع البقاء جاری ہے۔ پھر انتخاب طبعی ہے، اور بقاء و عاقبت اسی کے لئے ہے جو اصلح و احق ہے۔ ہزارہا خیالات و افکار پیدا ہوتے اور پھیلتے ہیں۔ لیکن باقی وہی رہے گا جو اصلح ہے۔

کے کہنے سے کیا مقصد ہے؟ اس کو پہلے خود سوچو، اور پھر انتظار کرو کہ آئندہ اشاعت میں قانون بقاء حق کی دوسری صحبت منعقد ہو۔

گذشتہ صحبت میں "تنازع البقاء" اور "انتخاب طبیعی" اور "بقاء اصلح و امثل" کی حقیقت پر ہم ایک مجموعی نظر ڈال چکے ہیں۔ اب قبل اس کے کہ اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں، مسئلہ انتخاب طبیعی کے تدریجی ارتقاء اور اس کے مختلف دوروں پر سرسری نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ قانون انتخاب طبیعی کے متعلق اس وقت تک انسانی معلومات کس درجہ تک پہنچی ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ انسان جو اس کے متعلق جانتا ہے وہ کیا ہے؟ گذشتہ صحبت میں ہم نے جو کچھ لکھا وہ گویا اس وقت تک کی تمام حاصل شدہ معلومات کا ایک مرتب سلسلہ تھا۔ لیکن ضروری ہے کہ اس قانون کے علم و اختیار کے درجہ بدرجہ جو مختلف مراتب رہے ہیں، ان کو بھی مختصراً واضح کر دیا جائے۔ ہمارے لئے ہمیشہ ایک بڑی مصیبت موضوع کی وسعت خیالات و افکار کا ہجوم و انتشار اور اختصار بیان کی ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس صحبت میں بھی یہی مشکل درپیش، تاہم جہاں تک ممکن ہوگا، اختصار سے کام لیں گے، اور عمداً اہم سے اہم اطراف بحث کو بھی ترک کر دیں گے۔

یہاں اس قدر ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ شاید بحث کا یہ حصہ بعض احباب کی نظروں میں خشک اور بے مزہ ہو۔ کیوں کہ محض تاریخی حالات و علمی مصطلحات پر مبنی ہے۔ لیکن ان حضرات کو چاہیئے کہ وہ اس ٹکڑے کو چھوڑ دیں اور اس کے بعد کے عنوان سے مطالعہ فرمائیں جہاں سے قرآن حکیم کی تصریحات شروع ہوتی ہیں۔

آخر میں اصلح باقی رہتی ہے۔ غیر اصلح فنا ہو جاتی ہے۔ سعدی کی گلستاں بمقابلہ جامی کی بہارستان کے اصلح تھی، وہ زندہ ہے۔ بہارستان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں، خواجہ حافظ اور سلمان ایک ہی عہد میں تھے۔ حافظ کا کلام اصلح تھا۔ اس کے عشق سے ہر دل معمور ہے۔ سلمان کا کلام اس کے مقابلے میں اصلح نہ تھا۔ صرف تذکروں ہی میں نام پڑھلو۔ ایک ہی وقت میں ایک چیز کے چند نام رکھے جاتے ہیں۔ ایک ہی حقیقت کے لئے مختلف اصطلاح وضع کی جاتی ہیں۔ ایک ہی حکمت کے لئے بہت سی کہاوتیں اور ضرب المثلین نکلتی ہیں۔ ان سب میں باقی وہی رہتی ہیں جو اصلح ہیں فطرتِ الٰہی تھوڑے ہی دنوں میں انتخاب طبیعی کا قانون نافذ کرکے بتلا دیتی ہے کہ زندگی کی کون مستحق تھی اور کس کو مٹ جانا تھا؟

حاصل مبحث یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے میں قوتوں کے تصادم اور کشاکش کی ایک جنگ بپا ہے۔ ایک دوسرے پر گرتی اور ایک دوسرے پر گرتی اور ایک دوسرے کو دفع کرتی ہے۔ اسی دفع و اندفاع کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں صحت و طاقت و سلامتی باقی رہتی ہے، اور نقص و فساد فنا ہو جاتا ہے۔ انتخاب طبیعی اسی کا نام ہے قوت اور صحت ہی کو فطرت باقی رکھے گی۔ اس نے کہہ دیا ہے کہ میں صرف اصلح و امثل کے ساتھ ہوں انہی کی حفاظت کروں گی، انہی کو آخر کی کامیابی دوں گی، اور وہی باقی رہیں گے

اب جب کہ تم یہ سب کچھ پڑھ چکے اور سن چکے، تو میں آخر میں عربی کے دو چھوٹے چھوٹے جملے بولوں گا جو قرآن حکیم میں ہیں۔ ایک یہ کہ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا۔ دوسرا یہ کہ العاقبۃ للمتقین۔ لیکن اتنی بڑی حکایت کے لبعد ان دو جملوں

چارلس ڈارون سے کچھ پہلے چند علماء طبقات الارض (جیولوجی) اور علماء احافیر واثریات (ارکیولوجی) کے نام ہم کو معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے زمین کے اندرونی طبقات کی بتدریج تکوین وتحقیق کے مطالعہ و درس میں تنازع البقاء کی طرف رہنمائی پائی، اور ان کو خیال ہوا کہ طبیعت کا کوئی غیر معلوم قانون ہے جو بہتر واصلح اشیاء کو قائم رکھتا اور ناقص شدہ اجزاء کو فنا کر دیتا ہے انتخاب طبیعی کے کشف کا یہ پہلا درجہ تھا جو گویا عالم جمادات میں ہوا۔ ان علماء نے تکوینِ ارض کے مختلف دوروں کی جو طبقات الارضی عمر قرار دی، اس میں تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کے اصولوں کو ایک نامکمل اور ابتدائی صورت میں ملحوظ رکھا ہے۔

دوسرا دور

اسی دور میں قبل اس کے کہ چارلس ڈارون اپنے مشہور مذہب ارتقاء کو دنیا کے سامنے پیش کرے، فرانس میں لامارک اور جوفرساں دو مشہور مذہب ارتقاء طبیعی کا ظہور ہوا، جنھوں نے ڈارون کی طرح مسئلہ وحدت انواع کو اپنا موضوع بحث قرار دیا۔

لامارک پیرس کے باغ نباتات کا مہتمم تھا اور اس میں نباتات کے علاوہ ایک بڑا ذخیرہ طرح طرح کے حیوانات کا بھی موجود تھا۔ حیوانات ونباتات کی مختلف انواع کے علمی درس ومطالعہ اور تربیت صناعی کے اعمال ونتائج سے اس کو مسئلہ وحدت انواع کی طرف ایک قوی تحریک ملی اور بالترتیب ۱۸۰۹ء

مراتب کشف و تحقیق بقاء اصلح

گذشتہ صحبت میں انتخاب طبیعی پر جو مجموعی نظر ڈالی گئی ہے، اس کے امثال و نظائر کو ہم نے انسان سے شروع کیا اور پھر نباتات و جمادات تک پہنچ کر افکار و ذہنیات و عالم معنویات کی طرف چلے گئے، لیکن اس قانون کی تحقیق و کشف کی تاریخ بالکل اس کے برعکس واقع ہوتی ہے یعنی سب سے پہلے انسان نے جمادات میں تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کو معلوم کیا، اس کے بعد حیوانات میں پھر انسان کے اجتماع و تمدن میں، اور سب سے آخر عالم افکار و ذہنیات و معنویات میں۔ حسب قانون ارتقاء اس قانون کے کشف و عالم میں بھی قدرتی طور پر اسی طرح ارتقاء کا ہونا ضروری تھا۔

بقاء اصلح اولین کشف

یہ عجیب بات ہے کہ قانون تنازع البقاء کی سب سے پہلی روشنی زمین کے بالائی سطح کی روشن فضا کی جگہ اس کے اندرونی طبقوں اور نہایت عمیق غاروں کی تاریکی میں چمکی!

میں بھی ایک مزاحمت اور کشاکش کو دیکھ لیتے ہیں۔

لیکن سب سے زیادہ جس شخص نے عالم نباتات میں انتخاب طبیعی کے قانون کا مطالعہ کیا اور اس کو قوت کے ساتھ پیش کیا، وہ فرانس کا ایک مشہور عالم نباتی "دی کاندل" ہے۔ اس نے ۱۸۲۰ء میں اپنی کتاب شائع کی اور اس میں تنازع البقاء کے قانون کو ایک منظم شکل میں پیش کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ کائنات نباتات ہمیشہ ایک عالم تنازع و مزحمت اور کشمکش میں ہے، اور جو فرد اور قسم اصلح و اقوی ہوتی ہے، باقی رہتی ہے۔ اور جو اصلح نہیں رہتی مٹ جاتی ہے۔

تیسرا دور

یہ انتخاب طبیعی کا دوسرا دور تھا کہ عالم نباتات میں بھی اس قانون کا کشف ہوا۔ تیسرا دور خود چارلس ڈارون کا ہے۔ جس نے اس قوت کے ساتھ مسئلہ نشو و ارتقاء کو پیش کیا کہ وہ ایک مدلل و مرتب نظریہ بن کر تمام علمی دنیا میں شائع ہوگیا۔ ڈارون نے اپنے نظریہ کی بنیاد جن قوانین پر رکھی، ان میں سب سے زیادہ اہم تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی ہے۔ اس نے انتخاب طبیعی کو ایک مستقل قانون طبیعت قرار دیا، اور نہایت تفصیل و کثرت سے اس کے امثال و نظائر جمع کئے۔ اس نے اپنی دوسری کتاب کا نام ہی یہ رکھا کہ پیدائش انواع بواسطہ انتخاب طبیعی یا بواسطہ حفظ انواع اکمل در

اور ۱۸۱۵ء میں اس نے اپنی دو کتابیں "فلسفہ حیوانات" اور نتائج حیوانات معدومہ" شائع کیں۔ ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب وحدت انواع میں اس کا زیادہ تر اعتماد قانون وراثت (HEREDITY) اور قانون مطابقت (ADAPT (ADAPTATION) پر تھا (جن کی تشریح گذشتہ اشاعت کے مضمون التحول الفجائی میں کی جاچکی ہے) تنازع البقاء اور انتخاب طبعی کو وہ زیادہ اہمیت نہیں دیتا تاہم اس سے بے خبر بھی نہیں ہے۔ اپنی دوسری کتاب میں جمادات کے علاوہ نباتات میں بھی طبیعت کے انتخاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

لامارک کا معاصر جیوفرساں ہے (المتولد ۱۷۷۲ء) اس نے ۱۸۲۸ء میں اپنی کتاب "اصل وحدت ترکیب عضوی" شائع کی۔ اس کا اعتماد زیادہ تر قانون مطابقت یعنی موثرات خارجیہ پر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ آب و ہوا، حرارت، رطوبت اور مقدار کاربونک وغیرہ کے اختلافات سے ایک نوع متاثر ہوکر مختلف انواع کی شکل میں متحول ہوگئی۔ تاہم اس نے بھی تنازع البقاء کی طرف اشارات کئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ نباتات تک اس کی بھی نظر پہنچ چکی تھی۔

اسی زمانہ میں دو مشہور شخص جرمنی کے اندر یہی مسئلہ وحدت انواع و نشو و ارتقاء پر غور کر رہے تھے۔ یعنی مشہور شاعر "گیٹے" (GOETHE) اور مشہور طبیعی "اوکن"، گیٹے نے ۱۷۹۰ء میں اپنی کتاب "تحول نباتات" شائع کی اور اوکن (المتوفی ۱۸۵۱ء) نے ۱۸۱۸ء میں فلسفہ طبیعیہ۔ یہ لوگ بھی لامارک کی طرح ابھی تنازع البقاء کی حقیقت سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں، لیکن کبھی کبھی اس طرح بھی ایک دو قدم بڑھ آتے ہیں۔ اور جمادات سے علاوہ نباتات

ہے۔ طبیعت نے انتخاب کے لئے مختلف عوامل و وسائل قرار دیئے ہیں۔ ان
ں خود انسان کا ہاتھ بھی فطرت کے اعمال کا ایک آلہ ہے فطرت الٰہی کبھی تو
ن کے ہاتھ میں تلوار دے دیتی ہے تاکہ غیر اصلح ہستیوں کو قتل کر کے مٹا دے
ور اس طرح فطرت کا دنیا میں خلیفہ ہو، اور کبھی اصلاح و تربیت کی قوت دے
دیتی ہے۔ تاکہ باقی رہنے والی قوتوں کی اصلحیت کا ذریعہ بن جائے اور اصلح
دنیا میں باقی رہے۔ خود انسان کوئی چیز نہیں ہے۔ ڈارون انسان تھا، وہ
وہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھ سکا، قرآن العلم ہے اور اختلافات کے
لئے علم، وہ اصل حقیقت کو واضح کر دے گا وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ۔

ڈارون کے بعد ہی رسبکہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً اس کے معاصر
ہم مشہور ویلز ہے جس نے خاص طور پر مسئلہ انتخاب طبیعی" کو اپنے
درس و نظر کا موضوع قرار دیا اور مستقل طور پر اس قانون کے کشف و حقیقت
کے لئے اپنے اعمال عملیہ وقف کر دیئے۔ مسلسل سیاحتوں اور بعض نو آبادیوں
اور غیر متمدن ممالک کے مشاہدات نے اس کو بہت مدد دی، اور مختلف قسم
کے حیوانات علی الخصوص صنف طیور کا اس نے خاصتاً مطالعہ کیا (الہلال جلد
کی آخری اشاعت میں ہم بتفصیل اس کے تجارب کے بحث کر چکے ہیں۔
نباتات و احیاء میں انتخاب طبیعی کے قانون کو جس وسعت کے ساتھ اس
نے ثابت کیا ہے۔ وہ درجہ خود ڈارون کو بھی نصیب نہیں۔ سب سے
پہلے بقاء امثل و اصلح (نیچرل سلکشن) کی اصطلاح اس نے وضع کی ہے
پس ڈارون اور ویلز انتخاب طبیعی کا تیسرا درجہ ہیں۔ جنہوں نے جمادات

تنازع البقاء:-

ڈارون نے ظاہر کیا کہ تنازع البقاء جمادات سے لے کر حیوانات تک میں جاری و ساری ہے۔ اور طبیعت اسی درخت اور اسی حیوان کو باقی رکھتی ہے جو اصلح و اقوی ہو۔ اس نے تنازع البقاء کی دو حالتیں قرار دیں فاعلی اور مفعولی فاعلی سے مقصود وہ کشمکش ہے جو حیوانات میں ایک کو دوسرے کے ساتھ در پیش ہے اور مفعولی وہ کشمکش ہے جو احیاء و حیوانات کو قوائے طبیعت صامتہ کے ساتھ پیش آتی ہے۔ پھر "انتخاب" کی بھی دو قسمیں کرتا ہے۔ طبیعی اور صناعی طبیعی اصلی انتخاب ہے۔ جو خود فطرت تدریج کر رہی ہے۔ اصلح کو باقی رکھتی ہے۔ غیر اصلح کو چھانٹ دیتی ہے۔ صناعی وہ انتخاب ہے۔ جو انسان کے ہاتھوں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ طرح طرح کی موثر تدبیروں اور ترتیبوں سے ایک نوع کے درخت کو قوت پہنچاتا ہے اور بہتر حالت میں لاتا ہے۔ پس وہ اصلح ہو کر حسب قانون طبیعت باقی رہتا ہے۔ یا کسی ایک زمین کو درست کرتا ہے۔ جھاڑیاں کاٹ دیتا ہے، کھڈوں سے بھر دیتا ہے، اطراف کو صاف کر دیتا ہے، وہ اصلح ہو کر لائق آبادی ہو جاتی ہے، یا کسی ایک نسل حیوانی کو لے کر پرورش کرتا ہے۔ عمدہ آب و ہوا میں رکھتا عمدہ غذا کھلاتا ہے اچھے اصولوں پر پرورش کرتا ہے۔ وہ اصلح ہو کر باقی رہتی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں غیر تربیت یافتہ نسل مٹ جاتی ہے وغیرہ ذالک من الامثال والاشباہ لیکن آگے چل کر تم کو معلوم ہوگا کہ انتخاب طبیعی اور صناعی کا یہ فرق ڈارون کی سخت غلطی تھی۔ جس انتخاب کو وہ صناعی کہتا ہے وہ کوئی مستقل قسم نہیں ہے بلکہ اسی انتخاب طبیعی کی ایک قوت عاملہ

زنجیر تک پہنچا ہے۔ یعنی وجود انسان تک اس کے بعد وہ بالکل خاموش ہے، اور چونکہ سلسلہ ارتقاء کو اس کے بعد نہیں دیکھتا، اس لئے بعض فطری عوامل و موثرات ارتقاء ہے، مثلاً انتخاب طبیعی اور مطابقت و وراثت، ان کو بھی وجود انسانی کے بعد معلوم نہیں کرتا۔

ڈارون کی اصلی غلطی یہ تھی کہ اس نے تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کو ایک مستقل قانون فطرت کی شکل میں نہیں دیکھا تھا، بلکہ اپنے نظریہ وحدت انواع (یعنی اصل میں صرف ایک ہی نوع ہے جس سے تمام انواع دعوا طلبِ خلقت بتدریج بن گئے ہیں) کے ضمن میں اس قانون کو بھی جگہ دی تھی۔ اس کا مذہب یہ تھا کہ ایک ہی نوع سے مختلف انواع اس لئے پیدا ہوگئیں کہ دنیا میں چار قوانین طبیعت تنازع البقاء، انتخاب طبیعی، مطابقت اور وراثت کام کر رہے ہیں، اور جس طرح انسان کا عمل اور صناعت مفید و نافع چیز کو چھانٹ لیتا، اور بچاتا ہے، اور مضر اور ناقص کو چھوڑ دیتا ہے، ٹھیک ٹھیک اسی طرح طبیعت بھی اصلح کو باقی رکھتی اور غیر اصلح کو ضائع کر دیتی ہے۔ پس ایک ہی نوع بہ تحت قانون مطابقت و وراثت، مختلف اثرات زمین و احتیاجات خلقت و تلاش وغیرہ سے متاثر ہو کر بتدریج متغیر ہوتی۔ تنازع البقاء جاری تھا، انتخاب طبیعی نے اصلح و اقویٰ کو باقی رکھا، غیر اصلح کو ضائع کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قوی و اسلم وجود برابر قائم و ترقی فرما رہا۔ حتیٰ کہ خلقت کی آخری زنجیر تک پہنچا جو انسان ہے۔

حالانکہ "انتخاب طبیعی" کا قانون ایک مستقل قانون فطرت ہے، جو مسئلہ وحدت انواع کا تابع نہیں، اور اگر ایک نوع کی جگہ مستقلاً ہر نوع کو ایک

اور نباتات کے علاوہ خود حیوانات میں بھی قانون انتخاب کی حقیقت و نفاذ کو معلوم کیا۔

چوتھا دور

لیکن اس دور تک انتخاب طبیعی کا قانون اگرچہ عالم حیوانات تک پہنچ چکا ہے اور انسان نے دیکھ لیا ہے کہ فطرت جمادات و نباتات کی طرح خود اس کی نوع یعنی حیوانات میں بھی اصلح کو باقی رکھتی اور غیر اصلح کو چھانٹ دیتی ہے، تاہم اب تک وہ اس سے آگے نہیں بڑھ سکا کہ حیوانات کا تنازع البقاء مرتبہ وجود انسانی سے نیچے جاری ہے، اور جب نوع حیوانی ترقی کرتے ہوئے وجود انسانی تک پہنچ گئی تو یوں کہ انسان زنجیر ارتقاء کی آخری کڑی ہے اس لئے اس کے بعد اور کچھ نہیں ہوتا۔

ڈارون کے مباحث و مذاکرات کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف انسان کے وجود کی تکوین تک اپنی تمام نظریات کو محدود رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں مخلوقات کا سلسلہ ارتقاء جمادات کی ہی ابتدائی تخلیقات سے شروع ہو کر عالم نباتات میں پہنچا ہے، اور نباتات سے حیوانات میں۔ پھر حیوانات میں حلقۂ اولیٰ (پروٹوپلاسم) کے ارتقاء اور مذہب کی بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے آخری

آخری درجۂ کشف و تحقیق

اب اس کے بعد حکماء یورپ ہم کو دو گروہوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔
ایک گروہ نے اپنا قدم آگے بڑھایا اور اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ سلسلۂ ارتقاء انسان تک پہنچنے کے بعد معدوم نہیں ہو گیا، بلکہ خود انسان میں بھی جاری ہے اور تمام قوانین طبیعت مثلاً انتخاب طبیعی وغیرہ بدستور کار فرما ہیں دوسری جماعت نے اس سے انکار کیا۔ اس نے کہا کہ اب عالم عضوی میں ارتقاء کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔ صرف تحول و تبدل ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ آخری جماعت مذہب "تحول" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور پہلی مذہب ارتقاء" کے نام سے۔
پروفیسر ہنگل پہلی جماعت میں سے ہے، مگر زیادہ قوت کے ساتھ آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔ انگلستان میں سب سے بڑا شخص جس نے تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کو وسعت دے کر چوٹی کے مرتبہ میں پہنچا دیا وہ مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر ہے۔ اس نے مسئلہ ارتقاء پر بالکل ایک نئی قسم کی نظر ڈالی، عوامل ارتقاء کو خود انسان کی اجتماعی اور قومی زندگی میں نافذ و جاری قرار دیا۔ اور انسان کی پوری اجتماعی زندگی کو قوانین مادیہ طبیعت پر مرتب کر دیا اس بارے میں اس کی کتاب "اصول سوشیالوجی" ایک انقلاب آفریں کتاب سمجھی جاتی ہے
اسپنسر کہتا ہے کہ خود انسان کی اجتماعی زندگی، اقوام کی پیدائش و موت تمدن

علیحدہ نوع بھی مان لیا جائے۔ جب بھی قانون انتخاب طبیعی کی حقیقت بدستور قائم رہتی ہے، اور وہ ہر حال میں ایک محکم و ناقابل انکار حقیقت ہے۔ بہر حال ڈارون تک انتخاب طبیعی عالم حیوانات تک میں تو معلوم ہو گیا مگر خود انسان کے وجود، اس کے اعمال اور فرد و اجتماع کی کشاکش و مزاحمت کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں پڑی۔ اس حد تک پہنچ کر قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ یہ تنازع البقاء یہ فطرت کا انتخاب یہ قوت مصلحہ و مدبرۂ عالم کا حفظ اصلاح و دفع فساد، کیا صرف پتھروں، مٹی کے منجمد ٹکڑوں، درختوں کی جڑوں اور چارپایوں اور چڑیوں ہی تک محدود رہے، یا تنازع البقاء خود انسان کی زندگی اور اعمال کے اندر بھی جاری ہے، اور اصلح باقی رہتا ہے اور غیر اصلح فنا ہو جاتا ہے؟ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ فطرت چڑیوں اور چارپایوں میں سے تو اصلح کو انتخاب کرے مگر خود انسان کے لئے اس کا قانون انتخاب بے کار ہو؟

ڈارون کے بعد جس شخص نے انتخاب طبیعی کو نسبتاً زیادہ وسیع دائرہ میں دیکھنا چاہا وہ پروفیسر ہیگل ہے، جو مذہب ڈارون کے مشہور منتصرین میں سے ہے تاہم کوئی مدلل وسعت پیدا نہ ہو سکی، کیوں کہ سب سے زیادہ توجہ اس کی قانون وراثت و مطابقت پر رہی۔ ساتھ ہی اس نے تنازع البقاء کا دائرہ ایک لحاظ سے تنگ بھی کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ تنازع البقاء اس لحاظ سے کہ ایک وجود دوسرے وجود کا مقابلہ کر کے بوجہ اصلحیت اس کو فنا کر دے، صرف ذی روح اجسام ہی میں محدود ہے۔ حالانکہ ہیگل سے پہلے ہم انتخاب طبیعی کو تمام کائنات عالم میں کام کرتا ہوا دیکھ چکے ہیں۔

کمی کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر زبانوں کے تنازع البقاء میں یہ زبان فتح مند نہ ہوتی اور اس لئے بوجہ غیر اصلیت مٹ گئی، تو عجب نہیں کہ ایک زمانہ آتے جب علماء علم اللسان کہیں کہ جرمن اور انگریزی زبان میں کوئی باہمی تعلق نہیں کیوں کہ دونوں کا درمیانی ٹکڑہ نہیں ملتا۔

لائل کے علاوہ جرمنی کا ایک اور محقق شلائخر بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے جس نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی اور ۱۸۶۳ء میں شائع کی کتاب کا نام اس کے موضوع کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی "مذہب ڈارون و علم اللغات" اس کتاب میں اس نے ظاہر کیا ہے کہ تمام لغاتِ عالم مذہب ڈارون کے مطابق پیدا ہوئی ہیں۔ مقابلہ اور کشمکش میں ہیں، پھر طبیعت انتخاب کرتی ہے، اصلح رہتی ہے۔ غیر اصلح مٹ جاتی ہے۔

حکماء جرمنی کا جدید دور

ان تمام لوگوں نے قانون انتخاب طبیعی کو اجسام و حیوانات سے بڑھا کر اجتماعیات و معنویات تک پہنچا دیا۔ لیکن فی الحقیقت اس مسئلہ کی تحقیق و کشف کا آخری درجہ جرمنی کی علم پرور و انقلاب آفریں سرزمین کے لئے مخصوص تھا۔ جس کے اندر گذشتہ قرن کے اندر چند ایسے افراد عالیہ و افکار مجددہ پیدا ہوئے، جنھوں نے قانون انتخاب طبیعی کو بالکل ایک نئی کائنات علم و تحقیق تک پہنچا دیا۔ اس مسئلہ کا یہ آخری دور ہے، اور یہاں تک پہنچ

وتہذیب کا عروج وزوال، اور نیز ہیئت اجتماعیہ کی ہر شاخ اسی قانون کے ماتحت ہے۔ یہاں بھی ہر جگہ تنازع البقاء جاری ہے، جماعتوں کا مقابلہ ہے، اصولوں کا مقابلہ ہے۔ صناعتوں کا مقابلہ ہے، تمدن وشائستگی کا مقابلہ ہے، علوم کا مقابلہ ہے، دولت واستعداد کا مقابلہ ہے، پھر زندگی اسی کے لئے ہے جو اصلح ہے اور طبیعت باقی اسی کو رکھے گی جس میں قوت ہے۔

اسپنسر کے علاوہ اس عہد میں اور بھی بعض مصنفین ایسے ملتے ہیں جنھوں نے تنازع البقا اور انتخاب طبیعی کے قانون کو حیوانات و اجسام کے علاوہ ذہنیات ومعنویات میں بھی دیکھنا چاہا تھا۔ ازانجملہ علم طبقات الارض کا ایک مشہور پروفیسر چارلس لائل ہے۔ جس نے ۱۸۶۳ء میں اپنی کتاب "عمر بشری" شائع کی اور اس میں قانون تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کو دنیا کی تمام زبانوں اور لغتوں پر منطبق کرنا چاہا۔ اس نے کتاب کا مواد زیادہ تر مشہور علم اللسان میکس ملر سے لیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کی زبانوں کے اندر بھی تنازع البقاء جاری ہے۔ جو زبان اصلح ہے باقی رہتی ہے، غیر اصلح مٹ جاتی ہے۔ یہ گویا انتخاب طبیعی کا عالم معنویات میں مشاہدہ تھا، اور اس اعتبار سے بلاشبہ پروفیسر موصوف کو ایک مخصوص مزیت حاصل ہے۔

لائل نے اپنی کتاب میں ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے جو مذہب ارتقاء پر کئے جاتے ہیں اور سب کی مثالیں علم اللسان سے پیش کی ہیں۔ ایک مشہور اور بڑا اعتراض یہ ہے کہ سلسلہ ارتقاء کی متعدد درمیانی کڑیاں ہیں جو نہیں ملتیں۔ لائل کہتا ہے کہ ہالینڈ کی زبان کو دیکھو جو انگریزی اور جرمن زبان میں ایک درمیانی

نیٹشے کے علاوہ جرمنی کے جدید حکماء میں ایک عظیم الشان شخص ٹریشکے[1] (TRCITSCHKE) بھی گزرا ہے۔ جس نے کوئی کتاب یادگار نہیں چھوڑی مگر اپنے درس و خطبات میں مسئلہ بقاء اصلح کو انسان کی حیات اجتماعی پر نہایت وسعت کے ساتھ منطبق کیا۔

حاصل صحبت

قانون انتخاب طبیعی کے مختلف دوروں اور انسانی علم کے منتہائے تحقیق کی یہ مختصر سرگذشت ہے۔ انسان ہزاروں برس تک انتخاب طبیعی سے بالکل بے خبر رہا، پھر سب سے پہلے جمادات و نباتات اور عام اجسام حیہ میں تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کو اس نے معلوم کیا، اور عرصہ تک اسی پر قانع رہا۔ وہ دنیا کی ہر ایک چیز میں تنازع البقاء کی جنگ کا تماشہ دیکھتا مگر خود اپنے وجود اور اپنے اعمال حیات کی طرف سے بالکل بے خبر تھا کہ خود اس کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ وہ درختوں، چڑیوں، رینگنے والے کیڑوں کا مطالعہ کرتا اور دیکھتا کہ انتخاب طبیعی کا قانون کس طرح جاری ہے اور فطرت اصلح کو باقی رکھتی اور غیر اصلح کو چھانٹ دیتی ہے پر کبھی اپنے وجود کو نہیں دیکھتا کہ یہاں بھی کس طرح

---

[1] جرمن زبان میں عموماً ... غیر ملفوظ ہوتا ہے، اور سی ایچ کا تلفظ اکثر واقات ش سے کرتے ہیں غالباً اس نام میں کبھی ای پڑھا نہیں جاتا۔ لوگ انگریزی ترکیب سے دھوکہ سے غلطی نہ کریں۔

کہ انسان نے جو کچھ اس بارے میں سمجھا ہے، وہ گویا اس کا منتہائے علم ہے۔

یہ آخری دور ڈاکٹر لوئس بخنر سے شروع ہوتا ہے جس نے شہر ادنبرگ کی یونیورسٹی میں مسلسل چھ لیکچر مذہب کے نشو و ارتقاء پر دیئے۔ اور ۱۸۷۵ء میں ان کا مجموعہ چھپ کر شائع ہوا۔ ہماری اس تحریر کا تاریخی حصہ اسی سے ماخوذ ہے بخنر نے اسپنسر کے ہم قدم ہو کر کائناتِ عالم کی ہر خلقت اور خود انسان کی اجتماعی زندگی کی ہر شاخ پر تنازع البقاء کو منطبق کیا ہے۔

بخنر کے بعد جرمنی کے علمی حلقوں میں برابر اس مسئلہ پر درس و مطالعہ جاری رہا یہاں تک کہ تاریخ علم و حکمت انسانی کا وہ سب سے بڑا شخص پیدا ہوا جس کے آگے یونانیوں کا پورا دورِ علم اور یورپ کی تمام کائناتِ فکر گرد ہو گئی یعنی مشہور پروفیسر نیٹشے (NEITZSCHE) اس عجیب و غریب حکیم نے دنیا کی پوری کائنات علم و فلسفہ کو یکسر منقلب کر دیا، اور جن اصولوں کو آج تک تمام ممالک متمدنہ اپنے ارتقاء علمی کا آخری مرتبہ سمجھتے تھے، اس نے ثابت کر دیا کہ وہ ادنیٰ ترین مرتبہ وہم و ضلالت ہے۔

از انجملہ مذہب ارتقاء ہے۔ وہ انسان کے ارتقاء و تسلسل اجتماعی و مدنی کا قائل نہیں، بلکہ مذہب دور کو از سرِ نو قائم کرتا ہے۔ یعنی کہتا ہے کہ ترقی کے بعد تنزل شروع ہو جاتا ہے اور تنزل کے بعد پھر ترقی شروع ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کے ماتحت انسان کی اجتماعی و قومی زندگی کو اس قدر شرح و بسط اور دلائل و حقائق کے ساتھ دیکھتا ہے کہ قدما میں سے کسی کو بھی یہ درجہ نصیب نہیں۔

القرآن الحکیم

حقیقتِ حق و باطل

دنیا اور دنیا کی تمام مخلوقات اور ان کے اعمال و نتائج پر جب ہم نظر
ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہم کو اعمالِ ہستی کے اندر متضاد اور باہمد گر مخالفت
حقیقتوں کی دو صفتیں نظر آتی ہیں، جو ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنے اپنے
آثار و خواص کے ساتھ موجود ہیں۔ اور تمام اعمالِ حیات انہی کے ملنے اور الگ
ہونے، جڑنے اور ٹوٹنے، متحد ہونے اور متخالف ہونے ٹکرانے اور ایک
دوسرے پر گرنے، اور پھر باہم متضارب و متصادم ہونے سے عبارت ہیں۔
ہستی کا کوئی گوشہ نہیں جس میں متضاد قوتوں کی کشاکش نظر نہ آتی ہو۔ دنیا نام
اس کشاکشِ قواء متضاد کا ہے۔ یعنی دو باہم لڑتی ہوئی مخالف قوتوں کے
آثار و خواص دنیا کی ہر چیز میں نظر آتے ہیں۔

ان متضاد حقیقتوں اور حالتوں کو مختلف دائروں میں اگر ہم مختلف ناموں
سے پکارتے ہیں۔ سب سے پہلا نام ان کا "کون و فساد" ہے۔ یعنی ہم دیکھتے ہیں
کہ دنیا میں اشیاء کا بننا، سنورنا، درست ہونا ہے، یا ان کا بگڑنا۔ بکھرنا، معدوم

اصلح باقی رہتا اور غیر اصلح مٹ جانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے ؟ یہ خود فراموشی انسان کی ایک عام غلطی ہے، اور اس کی نظر و فکر کے تمام دائروں میں نظر آتی ہے۔

لیکن پھر وہ آگے بڑھا، اور اس نے دیکھا کہ خود انسان کی اجتماعی زندگی بھی اسی قانون کے ماتحت ہے۔ اسپنسر نے اس کے لئے قدم اٹھایا۔ اور ٹرنشکے اور نیٹشے نے اس مطالعہ کو آخری مرتبہ کشف و بحث تک پہنچایا۔ لیکن تاہم یہ آخری مرتبہ بھی صرف اس حد تک پہنچ کر رہ گیا کہ انسان کی اجتماعی زندگی میں بقاء، قوی اور صحیح کے لئے ہے۔ لیکن یہ حقیقت کہ کیا انفرادی حالت میں بھی بقاءِ اصلح کا قانون کام کرتا ہے ؟ تو اس کے جواب سے تمام علم انسانی خاموش ہے پھر سب سے زیادہ اہم اور ضروری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم زندگی اور بقاء کو "اصلح" کے لئے قرار دیتے ہو، لیکن "اصلح" اور "اصلاح" کی حقیقت کیا ہے ؟ اور اصلحیت کے حصول کے صحیح اصول کیا ہیں ؟ اس سوال کے جواب میں یا تو خاموشی ہے۔ یا پھر اختلافات و نزاعات، ظنون و اوہام، تخمین و قیاسات ہیں۔ سب سے زیادہ بہتر جواب دینے کی نیٹشے نے کوشش کی ہے۔ مگر آگے چل کر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بھی نہیں بتلا سکتا کہ "صحیح" کی اصلی حقیقت ہے ؟

ان مراتب و توضیحات کے بعد ہم بالکل مستعد ہو گئے ہیں کہ مسئلہ بقاء حق کی تفسیری بحث شروع کریں، اور دیکھیں کہ یہ سب کچھ تو انسانی علم کی انتہا تھی، مگر قرآن حکیم یعنی "العلم" کیا بتلاتا ہے ؟

جسم کے لئے تم کہتے ہو کہ صحت و تندرستی ہے اور بیماری و ناخوشی، بہ لحاظ وحسیات میں کہتے ہو کہ لذت ہے یا الم، خوشی ہے یا غم، اشک حسرت ہیں۔ یا تبسم عیش۔

ان سب سے بھی بڑھ کر تمہاری عام اصطلاح یہ ہے کہ ایک حالت کو "موت" کہتے ہو، اور ایک حالت کو "زندگی" زندگی تمہارا عشق عمل ہے۔ اور موت تمہارے لئے پیام یاس۔

سو یہ بھی فی الحقیقت دو ہی دو مختلف حالتوں کی صفتیں ہیں جو اس رنگ میں آگئی ہیں، اور پہلے ان کو اور شکلوں میں تم پہچان چکے ہو۔

اب اور آگے بڑھو تم انسان ہو اور اس لئے ان متضاد حقیقتوں اور حالتوں کو اس سے زیادہ نہ دیکھ سکے لیکن قرآن حکیم آگے بڑھتا ہے اور ان متضاد حالتوں کو زیادہ وسیع یا زیادہ اصطلاحی - کی اور زیادہ حقیقت فرما اصطلاحوں سے موسوم کرتا ہے تم کہتے ہو کہ تکوین ہے، اور فساد، وجود ہے اور عدم، تعمیر ہے اور تخریب، بناؤ ہے اور بگاڑ، ضعف و نقص ہے اور قوت و کمال عدل ہے۔ اور انحراف، موت ہے اور زندگی، قرآن حکیم کہتا ہے کہ حق ہے اور باطل، اصلاح ہے اور فساد، ہدایت ہے۔ اور ضلالت معصیت ہے اور تقویٰ، اطاعت ہے اور طغیان، حسنات ہیں اور سیئات اور پھر ان سب سے بڑھ کر انسان سب سے جامع و مانع "اسلام" ہے اور "کفر"۔

جس طرح تم کائنات ہستی کے ہر عمل میں بناؤ دیکھتے ہو اور بگاڑ، اجسام و وجود میں قوت دیکھتے ہو اور ضعف، حسیات میں الم دیکھتے ہو اور لذت، اپنی

ہوتا ہے۔ مثلاً تکوین ہے اور بگڑنا فساد۔ اس کے بعد ہم فلسفہ و نظریاتِ حکیمہ میں آتے ہیں تو ہم کو "وجود و عدم" کی اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی انہی دو حقیقتوں کی تعبیر ہے فلسفہ بتلاتا ہے کہ دنیا میں وجود و عدم کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چیزیں مختلف صورتوں میں وجود پاتی ہیں، اور پھر ان کی صورتیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ تکوین صور وجود ہے اور اعدامِ صور عدم۔ علوم مادیہ میں انہی حقیقتوں کو دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں۔ علم کہربا (الکٹرسٹی) میں انہی کا نام منفی و مثبت ہے۔ یعنی ایک قوت نفی کی ہے ایک اثبات کی۔ طبیعات میں انہی کا نام جذب و دفع ہے۔ اسی کو ایجاب و سلب بھی کہتے ہیں۔

اخلاق میں آکر یہی دو حقیقتیں ہیں جن کو تعمیر و تخریب سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی بنانا اور خراب کرنا۔ پھر جب کچھ اور آگے بڑھتے ہیں تو کون و فساد کے یہی دو چہرے ہیں جو خیر اور شر نیکی اور بدی، روشنی اور اندھیارے کے مقابلوں میں اپنی نمائش کرتے ہیں اور ان کو نئے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن خواہ کتنے ہی مختلف ناموں سے پکارا جائے، دراصل حقیقت ایک ہی ہے، اور مختلف علوم میں آکر انسانی علم نے ان کے مختلف نام رکھ دیئے ہیں۔

اور آگے بڑھو اور دیکھو کہ یہی دو حقیقتیں اور کن کن شکلوں میں موجود ہیں اور کام کر رہی ہیں؟ تمام اجسام و وجود پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ دنیا کی تمام موجودات میں یا قوت ہے یا ضعف، یا قوی ہے یا ضعیف، یا سالم ہے یا ناقص یا عدل ہے یا انحراف، سو یہ بھی فی الحقیقت وہی دو عالمیں ہیں جن کو پہلے مختلف ناموں سے پکار چکے ہو۔

فطرت کا قانون ہے۔ جو حق کو باقی رکھتا ہے اور باطل کو فنا کرتا ہے؟

اصطلاحات کے اختلاف نے کس طرح حقیقت کو پیچیدہ بنا دیا ہے؟ تم جب کبھی قانون انتخاب طبیعی پر بحث کرتے ہو اور کہتے ہو کہ بقاء اصلح کے لئے ہے، تو یہ نہیں جانتے کہ ٹھیک ٹھیک اسی حقیقت کا اقرار کر رہے ہو جس کو قرآن حق و باطل اور اسلام و کفر کے نام سے پیش کرتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ضعف و نقص فنا ہوگا۔ طاقت اور صلاحیت باقی رہے گی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہی شے جس کو تم ضعف کہتے ہو میری زبان میں باطل اور کفر ہے، اور وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جتنا تم سمجھتے ہو۔ پس بقاء حسن کے لئے ہے۔ طاقت صرف حق، سچ، عدل اور عمل صالح میں ہے۔ وہ باقی رہے گا، اور جو اس کے مقابلے میں اٹھے گا فنا ہو جائے گا۔

انتخاب طبیعی اور قرآن حکیم

اب ہر طرف سے ہٹ کر سب سے پہلے قرآن حکیم اور العلم حقیقی کے سامنے مسئلہ انتخاب طبیعی کو عرض کرو۔ قرآن حکیم نے صاف صاف اس تنازع البقاء اور انتخاب طبیعی کے قانون کو جابجا واضح کیا ہے اور وہ بقاء اصلح و امثل کو ایک قانون الٰہی اور امر مقدر قرار دیتا ہے۔ چونکہ آگے چل کر تمام آیتوں کی تفسیر ہوگی۔ اس لئے یہاں صرف ایک آیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۃ رعد میں فرمایا۔

حیات جسمانی میں عدل مزاج کو دیکھتے ہو اور انحراف کو، پھر کہتے ہو یہ تندرستی و بقاء ہے اور وہ بیماری وہلاکت۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح قرآن حکیم ہے کہ ہدایت ہے اور ضلالت معصیت ہے اور تقویٰ، سعادت ہے اور شقاوت۔ پھر جس طرح تم کہتے ہو کہ ضعیف مٹ جائے گا اور بیمار مر جائے گا۔ طاقت و صحت باقی رکھتی ہے اور کمزوری و بیماری ہلاک کر دیتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ کہتا ہے کہ باطل مٹ جائے گا۔ اور گمراہ ہلاک ہو جائے گا۔ ہدایت انسان کو باقی و قائم رکھتی ہے اور ضلالت ہلاک کرتی ہے۔ عمل صالح صرف بقاؤ فتح کے لئے ہے اور عمل مفسد فنا و خسران کے لئے!

تم اپنے محدود علم میں صرف اتنا جانتے ہو کہ طاقت و صحت اور عدل و توفیق زندگی کو بڑھاتا اور نقصان و ہلاکت سے بچاتا ہے، لیکن "العلم" اور البصائر یعنی قرآن بتلاتا ہے کہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اور آگے بڑھو اور یوں بولو کہ عمل صالح و حق باقی رکھتا اور طاقت بخشتا ہے، اور عمل غیر صالح فنا کرتا اور نقصان و کمزوری پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اتنے سارے لفظ نہ بولو اور ایک ہی حقیقت کو بہت سی شکلوں میں دیکھ کر گم نہ ہو جاؤ۔ بلکہ صرف ایک ہی لفظ بول دو۔ دنیا میں یا حق ہے یا باطل یعنی یا قوت ہے یا ضعف۔ حق باقی رہے گا اور باطل تباہ و ہلاک ہو گا۔ یہی طاقت باقی رہے گی اور کمزوری تبدریج موت تک پہنچ کر فنا ہو جائے گی۔

تم کہتے ہو کہ دنیا میں انتخاب طبعی یا بقاء اصلح کا قانون جاری ہے، اور کائنات ہستی کے تمام وہ انقلابات و تغیرات اسی کا نتیجہ ہیں جن میں وجود و اعدام، غلبہ اور انہزام، اور زندگی اور موت کا سلسلہ ہمیں نظر آتا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر پھر تم کیوں نہیں آگے بڑھتے اور کیوں نہیں تسلیم کر لیتے کہ یہ انتخاب

ربانی نے ایک کائنات حقیقت اور دنیا مسابقت کو کھیر دیا ہے۔ آگے چل کر اس کی تفصیل آنے آئے گی۔ مگر یہاں چند امور پر غور کرو۔

۱۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ دنیا میں بقاء وجود کے لئے اللہ تعالیٰ کا کونسا قانون کام کر رہا ہے؟ پھر بتلا دیا ہے کہ وہ انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح ہے۔

۲۔ فرمایا اس کی مثال یوں ہے کہ پانی برسا اور زور سے نالے، ندیاں اور وادیاں بہنے لگیں۔ پانی کے زور سے جھاگ پر جھاگ اٹھ رہی ہے اور ابل ابل کر اطراف میں پھیل رہی ہے۔ لیکن دیکھو کہ پانی کی رو جھاگ کو کس طرح بہا کر لے جاتی ہے جو بے کار اور لا حاصل ہے، اور کس طرح پانی کا مفید، ضروری، نافع اور بقدر ضرورت حصہ وہیں جم کر رہ جاتا ہے؟ اس کے بعد اسی حالت کو اس وقت دیکھو جب کہ کھوٹ اور میل صاف کرنے کے لئے کسی چیز کو آگ پر تپاتے ہو، اس وقت بھی میل کٹ کر جھاگ کی صورت میں نکل جاتا ہے اور اگر سونا ہے تو صاف اور کھرا اندر رہ جاتا ہے۔

۳۔ پس یہ جو کچھ ہو رہا ہے سو کیا ہے؟ فرمایا کہ یہ ایک قانون ہے کہ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ یعنی جس چیز میں نفع اور فائدہ ہے وہی زمین پر رہے گی، اور جو نافع نہیں ہے وہ جھاگ اور میل کی طرح چھانٹ دی جائے گی۔ اس کو زندگی نہیں مل سکتی۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ پانی کی طرح جھاگ کو اور سونے کی طرح میل کو بچا کر رکھا جائے۔

۴۔ اس کے بعد کیسے واضح لفظوں میں فرمایا کہ کذٰلک یضرب اللہ الحق

انزل من السماء ماء	اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پس اپنی
فسالت اودیة بقدرها	گنجائش کے مطابق زمین کے نالے پانی سے
فاحتمل السیل زبدا	بھر گئے اور بہ نکلے۔ ساتھ ہی اوپر تہ
رابیا ومما یوقدون	پانی کی روانی نے لی اور پانی کا روانی نے
علیه فی النار ابتغاء	اور پانی کی سطح تہ جھاگ سے بھر گئی۔ اب
حلیة او متاع زبد	دیکھو کہ کس طرح پانی کی رو جھاگ کو بہائے
مثله کذلک یضرب	جا رہی ہے اور طرف مفید ضرورت پانی
الله الحق والباطل، فاما	نیچے رہ گیا ہے ۔ اسی طرح اس وقت بھی
الزبد فیذهب جفاء	جھاگ اٹھتی ہے جب آگ پر صفائی کے
واما ما ینفع الناس فیمکث	لئے سونے کو اور طرح طرح کی چیزوں کو
فی الارض، کذلک	تم تپتے ہو اور تپاتے ہو میل کچیل تہ نکل
یضرب الله الامثال	جاتا ہے اور خالص اور صاف سونا باقی رہ
للذین استجابوا لربهم	جاتا ہے ٹھیک ٹھیک یہی مثال حق و باطل
الحسنی (۱۳، ۱۷)	کی ہے پس جو چیز محض جھاگ ہے وہ بہہ کر

اکھڑ جائے گی اور اس کو بقا و زندگی نہیں دی جائے گی لیکن جو چیز نفع اور فائدہ دینے والی ہے اور اس لئے نافع وجود کا حکم رکھتی ہے، وہ زمین پر باقی و قائم رہے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سعادت و بقاء حیات کی حقیقتوں کو مثالوں کی دعائی میں سمجھاتا ہے تاکہ اطاعت فرمایان حق، نصیحت پکڑیں۔

یہ آیت کریمہ عجیب و غریب ہے اور چند جملوں کے اندر اعجاز الہیٰ و علم و حکمت

یہ بڑی ہی حکمت اور عدل فرمائی ہے کہ اس نے تنازع حیات میں طاقت وانح صلح کو دفع و غلبہ کا ذریعہ بنایا تاکہ صرف صحت ہی دنیا میں باقی رہے۔ یہی چیز ہے جس کو ڈارون نہ پا سکا اور جس کے لئے جرمنی کا حکیم اعظم "نیٹشے" بے قرار ہے مگر اپنے سامنے نہیں آتا۔

اب تمام مقدمات ختم ہو گئے۔ آئندہ صحبتوں میں اصل بحث شروع ہو گا اور وہ اس قدر اہم و اعظم ہے کہ اگر بہتر طریقہ سے صاف ہو گئی تو دو تہائی قرآن حکیم کی تفسیر ایک ہی مضمون میں ہو جائے گی۔

والباطل: حق اور باطل کی یہی مثال ہے:۔ فاما الزبد فیذھب جفاء۔ پس جھاگ جو نافع نہیں ہے وہ باطل ہے، باطل بہہ جاتے گا۔ چھانٹ دیا جائے گا۔ فنا ہو جائے گا، حق وہ ہے جس کی تعریف ما ینفع الناس کے لفظوں سے سمجھو۔ یعنی وہ چیز جو نافع ہے، اور اس لئے اصلح اور امثل وا وفق ہے۔ پس وہی باقی رہے گی، اور باقی رکھی جاتے گی۔

۸۔ انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح کی صحیح حقیقت یہی ہے۔ اور اس آیت نے صاف صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ بقاء حق اور فناء باطل اسی قانون کا ظہور ہے۔

اگر تم کہو کہ تنازع البقاء کی اس میں صراحت نہیں تو اس کے لئے سورۃ بقرہ کو پڑھو۔ فرمایا:۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت الارض ولکن اللہ ذو فضل علی العالمین (۲: ۲۵۴)	اور اگر اللہ تعالیٰ ایسا نہ کرتا کہ بعض انسانوں کے ذریعہ بعض کو دفع کراتا تو زمین تباہ ہو جاتی۔ لیکن اللہ کی حکمت کائنات کے لئے فیض و احسان ہے کہ وہ انسان کو اصلاح سے دور کراتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ اگر ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے کو دفع نہ کیا جاتا تو زمین میں اصلاح باقی نہ رہتی اور وہ صرف نقص اور فساد کا گھر بن جاتی۔ خدا تعالیٰ کی حکمت نے تنازع البقاء کے ذریعہ ایک دوسرے کو دفع کرایا اور یہی قوت دافع فساد و بقاء اصلح و امثل کا ذریعہ ہے۔ پس

لیکن اگر عطر کو شیشی میں بند رکھا جائے تو وہ مشام جان کو معطر نہیں کر سکتا۔ (۳)
کی بو تو عطر کو بار بار کے ملنے ہی سے پھیلتی ہے اسی طرح اگر انسان تمام دنیا
سے الگ ہو کر ایک تنہا گوشہ پر عزلت گزینی اختیار کر لے تو اس کا اخلاقی جوہر
ہمیشہ کے لئے پہاڑ کی تاریک غاروں میں چھپ جائے گا۔ لیکن خدا نے انسان
کو اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی بنا پر انبیاء کرام علیہم السلام
نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیل اخلاق قرار دیا۔ وہ خود بھی دنیا کے منظر عام
پر نمایاں ہوتے اپنی امت کو بھی نمایاں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت
کی نمائش وادی تیہ میں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مقصد کے لئے
ایک وادی غیر ذی زرع کو منتخب فرمایا، اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم
نے تو کائنات عالم کے ہر میدان میں اپنا اور اپنی امت کا اسوۂ حسنہ پیش
کر دیا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت
للناس تامرون بالمعروف
وتنھون عن المنکر

تم لوگ دنیا کی ایک بہترین امت ہو
جو منظر عام پر نمایاں کی گئی، کہ تم نیکی
کا حکم کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو۔

وکذلک جعلناکم امۃ
وسطا لتکونوا شھداء
علی الناس ویکون الرسول
علیکم شھیدا۔

اور ہم نے تم کو ایک صاحب عدل و
معدلت قوم بنایا تاکہ تم تمام دنیا کے
آگے اپنے زبان و عمل سے حق کی شہادت
دو، اور اس شہادت کی روشنی صرف اپنے
رسول سے اخذ کرو۔

جنگ کا اثر اخلاق پر

دنیا کے گوشے گوشے میں قوت کا خزانہ پنہاں ہے۔ بجلی کی رو خاک کے ہر ذرّے میں موجود رہتی ہے۔ نمو کی قوت زمین کے چپے چپے میں مخفی ہے۔ موجوں کا تلاطم ہر دریا کے اندر چھپا ہوا ہے لیکن یہ قوتیں خودبخود نہیں ابھرتیں۔ بلکہ اپنے ظہور کے لئے ایک سخت کشمکش، ایک سخت مقاومت، ایک سخت تصادم کی منتظر رہتی ہیں۔ پس جب کوئی قوت ان کو ٹھوکر لگا دیتی ہے، تو وہ برہم ہو کر اپنے چہرۂ زیبا سے نقاب الٹ دیتی ہیں۔ حرکت بجلی کے خزانے میں آگ لگا دیتی ہے۔ آفتاب کی رو زمین کی قوت نمو کو ابال دیتی ہے ہوا کے جھونکے سطح دریا پر موجوں کا جال پھیلا دیتے ہیں!

---

* اخلاق بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون و ارواح میں چھپی ہوئی۔

انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی علت ہے کہ اسلام نے اپنے تمام اعمال کی تربیت کے لئے اخلاقی موثرات میں سے صرف جہاد ہی کو منتخب کیا ہے۔ کیوں کہ اخلاقی انقلاب کا اس سے زیادہ کوئی موثر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

زمانۂ جنگ میں عارضی طور پر انسان کا نظام اخلاق دفعتاً بدل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عیب ہنر اور ہنر عیب ہو جاتا ہے۔ تجسس ایک سخت بد اخلاقی ہے لیکن زمانۂ جنگ میں جاسوسی ایک ہنر خیال کی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے بہترین قابلیت کے اشخاص منتخب کئے جاتے ہیں۔ صیانت نفس ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے، لیکن میدانِ جنگ سے فرار انتہا درجہ کی بد اخلاقی سمجھی جاتی ہے۔ محاسنِ اخلاق میں رحم دلی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ لیکن صف دشمن میں اس کی قدر دانی نہیں کی جاتی غیروں کے حقوق کی حفاظت تمدن و قانون کا بہترین کارنامہ ہے۔ لیکن زمانۂ جنگ میں قانون ہی غیروں کے ملک کا دوسرے سلطنتوں کے ساتھ الحاق کر دینا اور مال غنیمت جس طرح وحشی قوموں کے لئے ذریعہ معاش تھا، اسی طرح تمدن کا بھی بہترین اندوختہ بن جاتا ہے۔ امن کی حالت میں عفو و درگذر، حلم و تحمل، اپنے اندر ایک اخلاقی مقناطیسی کشش رکھتی ہیں، لیکن صف جنگ میں طلاقتِ وجاہد حلم آمیز تبسم سے زیادہ درشت روئی کی قدر کی جاتی ہے۔ کفایت شعاری نہایت عمدہ چیز ہے لیکن میدان جنگ صرف اسراف ہی کے ذریعہ سے فتح ہو سکتا ہے۔ وفائے عہد یا اخلاقی عظمت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے۔ لیکن زمانۂ جنگ میں ہزاروں بدعہدیاں جائز خیال کی جاتی ہیں۔ اس قسم کے سینکڑوں اخلاقی عیب

اسلام نے اسی اصول کی بنا پر رہبانیت کو ناجائز قرار دیا، کیوں کہ انسان کا اخلاقی جوہر بھی دنیا کی دوسری قوتوں کی طرح تصادم و کشمکش ہی کے ذریعہ نمایا ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چوں کہ انسان کو اخلاق حسنہ کا مظہر بنایا ہے جیسا کہ خود فرمایا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ — ہم نے انسان کو ایک بہترین طبیعت مرکبۃ عادلہ میں پیدا کیا۔

اس لئے اُس نے ایسے اسباب مہیا کر دیئے جو انسان کے محاسنِ اخلاق کو ہر وقت نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک شخص گھر میں ہے تو اعزہ و اقارب کے تعلقات سے اس کے اخلاق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر بزمِ احباب میں ہے، تو دوستوں کے اختلاط و ارتباط کو اس کے اخلاق کا معیار بنایا جا سکتا ہے، اگر وہ کسی بازار میں ہے تو معاملات کے ذریعہ اس کے عیب و ہنر نمایاں ہو سکتے ہیں۔

لیکن جنگ ایک ایسی سخت ٹھوکر ہے، ایک ایسا سخت زلزلہ ہے، ایک ایسا سخت دھماکہ ہے، جس سے دنیا کا ایک ایک ذرہ جنبش میں آجاتا ہے، اور اس کی تمام قوتیں دفعتاً متحرک ہو جاتی ہیں۔

اخلاق بھی ایک عظیم الشان قوت ہے، اس لئے وہ بھی جنگ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے، اور اس کے اثر سے انسان کے نظامِ اخلاق میں ایک نمایاں

دنیا سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔ ترکوں کی جنگ جوئی عام طور پر ضرب المثل ہے۔

چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغما را

زمانۂ جنگ میں جن اخلاق و عادات کو ناگزیر خیال کیا جاتا ہے، ان میں بہت سے ایسے ہیں جن سے بلا تکلف بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے جنگ کے لئے اگرچہ جاسوسی ایک ضروری چیز ہے، لیکن جاسوس فوج کے ضروری اجزا نہیں ہوتے میدانِ جنگ میں کبھی کبھی دشمن پر رحم بھی کیا جا سکتا ہے۔ فقر و فاقہ کی حالت میں بھی جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے؛ اور دولت کی بارش اس کے لئے چنداں ضروری نہیں۔ لیکن "شجاعت" ایک ایسی چیز ہے جو جنگ کی حقیقت میں داخل ہے اور اگر کوئی شخص میدانِ جنگ میں عزم و استقلال کے ساتھ کھڑا رہنا چاہتا ہے، تو اس کو سب سے پہلے پاؤں میں اس کی سنہری زنجیر ڈال لینی چاہئے۔

جن قوموں کو اتفاقی ضرورت سے لڑنا پڑتا ہے، اگرچہ ان کے لئے بھی شجاعت نہایت ضروری ہے، لیکن جو قومیں ہمیشہ لڑتی بھڑتی ہیں، ان میں شجاعت کا ایک مخصوص ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خاص طور پر اس وصف میں دوسری قوموں سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔

مرد عورتوں سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے مختلف لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، یہی

مظہر ہیں جن کی حقیقت زمانۂ جنگ میں بالکل بدل جاتی ہے۔ اور ضرورت ان کے بدل دینے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

لیکن ابتدا میں دنیا کی ہر چیز عارضی ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ عارضی اسباب سے زمین پر پانی کے قطرے گرتے ہیں، اور آہستہ آہستہ زمین میں سوراخ کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ مستقل گڑھے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک پتھر پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں اور وہ ان کا رنگ جذب کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن لعل شب چراغ کے قالب میں نمایاں ہو کر دنیا کی آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے!

انسان کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے۔ بچہ ماں کے پیٹ سے ایک سادہ شیشہ دل لے کر آتا ہے جس میں ہر عکس کے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ دنیا کی جو طاقت اس پر اپنا پرتو ڈالتی ہے، آہستہ آہستہ اسی اثر کو قبول کرتا جاتا ہے، اور ایک دن اسی قوت کا مجموعی اثر اس کا اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے۔ انسان کے اخلاق کا سب سے بڑا مظہر عادت ہے لیکن یہ ملکہ بھی کسی فعل کے متواتر عمل ہی میں لانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اس عالمگیر قدرتی اصول کی بنا پر جن قوموں کو جغرافیانہ حالات، تمدنی ضروریات اور قومی خصوصیات ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رکھتی ہیں، وہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ میدانِ جنگ ہی میں بسر کرتی ہیں۔ یہی عارضی نظام اخلاق آخر کار مستقل اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے، اور وہ ان اخلاقی خصوصیات میں تمام

میں "پا برکاب" کے استعارے کو بھی میدانِ جنگ کی عاجلانہ مستعدیوں نے پیدا کیا ہے۔

لیکن کبھی کبھی ایک ہی متدد اور عظیم الشان جنگ، اس قسم کی مستقل شجاعت پیدا کر دیتی، اور فتح وظفر کی نشاط انگیز مسرت اس آتش سیال کو اور بھی دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ آج بہیں کتی قومیں ایسی نظر آتی ہیں جو اگرچہ ہمیشہ مصروفِ جنگ نہیں رہیں لیکن صرف ایک ہی فاتحانہ جنگی اقدام، یا ایک ہی بامراد معرکۂ قتال نے ان کو ایک مستقل اور دائم وقائم جنگی قوم بنا دیا ہے!

تاتاریوں کی مشہور شجاعت بھی اسی عالمگیر طوفان کی ایک موج ہے جو ساتویں صدی میں تمام دنیائے اسلام میں پھیل گیا تھا؛ اور بعد کی صدیوں میں ہجوم اعداء نے اس کو اور بھی مستقل کر دیا۔

اس مستقل شجاعت کا اثر صرف میدانِ جنگ ہی میں ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبۂ عمل میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ تمام قوم میں ایک حرکت پیدا کر دیتی ہے جو اس کے تمام قوائے خفتہ کو بیدار رکھتی ہے۔ جرمنی کی جنگ پرستی کا نشہ فرانس و بلجیم کے میدانوں سے زیادہ برلن کے کارخانوں، کالجوں، عام بازاروں میں منظر آیا تھا۔

قومی کا یہ نشاط قوموں کی افزائش نسل پر بھی نمایاں اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیر کی ابھرنے والی بہادرانہ قوت جب ایک پنجرے

کشمکش ان کے جذبات شجاعت کو زیادہ نمایاں اور مستحکم کر دیتی ہے۔

لیکن اگر متمدن اور وحشی قوموں کا مقابلہ کیا جائے۔ تو ان میں بھی مرد اور عورت کی سی نسبت نظر آئے گی۔ متمدن قوم ایک عظیم الشان شہر کی چار دیواری میں محصور رہتی ہے۔ اس کو خارجی خطرات کا بالکل ڈر نہیں رہتا۔ شہر کے اندر پولیس حفاظت کرتی ہے۔ وہ امن وسکون کی حالت میں آرام کی نیند سوتی ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ اس کی قوت دفاعی بے کار ہو جاتی ہے اور شجاعت کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایک بدوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ کھلے ہوئے میدان میں رہتا ہے، اور اپنی تمام چیزوں کی حفاظت خود ہی کرتا ہے۔ چور، ڈاکو، غنیم، اس پر حملہ کرتے ہیں، اور وہ صرف اپنی قوتِ بازو سے ان کو دفع کرتا ہے۔ اس لئے اس کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ ٹھوکر لگتی رہتی ہے، اور اس سنگِ چقاق سے ہمیشہ شرارے نکلتے رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے پہلو میں ایک گرم دل، اور دل میں گرم خون کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتا ہے۔ یہی خون اس کی رگوں میں ہر وقت حرکت کرتا رہتا ہے، اور وہ ایک معمولی سی صدا پر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

عرب جس نے قیصر وکسریٰ کے تخت وسلطنت کو دفعتاً الٹ دیا، اسی قسم کی شجاعت کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت میں بہادروں کا ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو ہمیشہ گھوڑے کی لگام زنار کی طرح اپنے گلے میں آویزاں رکھتا تھا۔ اور ہر وقت میدانِ جنگ کے لئے پا برکاب رہتا تھا۔ فارسی لٹریچر

کی حالت میں زندگی بسر کی تھی۔ اور اس کا قدرتی اثر اس کے بعد بھی پڑا
تھا۔

۳

اجتماع و انضمام کی حالت میں اگرچہ افراد کی خصوصیات فنا ہو جاتی ہیں اور ایک مستقل اجتماعی قوت پیدا ہو جاتی ہے لیکن بوسیدہ اینٹیں کب تک دیوار کو قائم رکھ سکتی ہیں؟ بالآخر افراد کی مخفی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے، اور یہ شیرازہ دفعتاً درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء کی شکست نے فرانسیسیوں کے جذبات شجاعت کو بالکل پامال کر دیا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ مظاہر شورش تعلیم، اور مختلف انقلابات نے ان کے خون کو بہت کچھ گرم کر دیا، تاہم میدان جنگ میں وہ اپنے قدیم داغ کو چھپا نہ سکے اور باوجود تمام افواج و تعاصر فلفار اپنی کھوئی ہوئی شجاعت کو واپس نہ بلا سکے۔

متصل ذلت آمیز شکستوں کا اثر بھی کبھی اس قدر مستقل ہو جاتا ہے کہ روحانی طاقت بھی بمشکل اس کو مٹا سکتی ہے۔ یہودیوں کو بار بار کی شکست اور ایک زمانہ ممتد کے اسر و غلامی نے اتنا تو بزدل بنا دیا تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیت المقدس میں ان کو فاتحانہ داخل کرانا چاہا تو ان کی رعد آسا آواز اور بیت المقدس کی مذہبی عظمت بھی یہودیوں کے دلوں کو نہ

میں قید کر دی جاتی ہے تو اس کا شجاعانہ نشاط فنا ہو جاتا ہے، اور اس کے
توالد و تناسل کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔
اس کے برعکس بزدل قوم قلیل النسل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک
مدت کی غلامی کا افسردہ کن اثر مفتوح قوموں کو فنا کر دیتا ہے۔

لیکن ایک ہی قوت متضاد نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے۔ پانی کی طغیانی
اگر سطح دریا پر موجوں کے سر پر غرور کو بلند کر دیتی ہے تو بہت سے سر اٹھانے
والے کنگرے اس کی رو میں پست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جنگ اگر ایک قوم
کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ کے لئے ابھار دیتی ہے، تو دوسری قوم کو ہمیشہ
کے لئے بزدل بھی بنا دیتی ہے۔ شخصی حالتوں میں بھی یہ بزدلی نمایاں طور پر نظر
آتی ہے۔

انگلستان کے مشہور فلاسفر ٹامس، ہوب نے اپنی بزدلی کی یہ وجہ
بتائی ہے کہ وہ جس زمانے میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا، انگلستان کو اسپین کے
لوگ جنگ و غارت گری کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے؛ اور ان کی فوجیں ہمیشہ
ساحل انگلستان پر چکر لگایا کرتی تھیں۔ اس وقت تمام انگلستان کے ساتھ
اس کی ماں بھی اضطراب و خوف میں مبتلا تھی۔ اس کے اضطراب و بےچینی نے
بچے میں یہ بزدلی پیدا کر دی!

انگلستان کے سلاطین قدیم میں یعقوب ثانی سخت بزدل تھا۔ اس
کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ماں نے سخت مصیبت و اضطراب

نصاریٰ کی راہ سے الگ کر کے " الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین"
کی صراط مستقیم پر قائم کر دیا تھا۔ اور یہی ان کی وہ فضیلت مخصوص ہے جس کی
بنا پر زبانِ الٰہی نے مغضوبیت کی جگہ محبوبیت کا مرتبۂ اعلیٰ انہیں عطا کیا اور
فرمایا۔ یحبہم ویحبونہ خدا ان کو پیار کرے گا اور وہ خدا کو پیار کرنے والے
ہوں گے۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ وہ گذشتہ اقوام کی طرح مغضوب
ومبغوض کیوں کر ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کے ایثار و قربانی و ابتغاء مرضات
اللہ کی وجہ سے خدا ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ کی بخشی ہوئی خلافت و وراثت
ارضی پا کر خدا سے راضی و خوشحال ہیں!

لیکن اس قسم کی مستقل شجاعت کبھی کبھی عارضی شکست کبھی کھا جاتی
ہے۔ مگر اس حالت میں بھی صرف فوج ہی کی جمعیت کو صدمہ پہنچا ہے دل
مضبوط و استوار رہتا ہے۔ غزوۂ احد میں ابتلاء الٰہی نے صحابہ کو منہزم کر دیا تھا۔
لیکن ان کی جانبازی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح آنحضرت پر پروانہ وار
فدا ہوتے رہے۔ جس طرح غزوۂ بدر میں فدا ہوتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت نے جب
ایک موقع پر گردن ملند کر کے کفار کی جمعیت کو دیکھنا چاہا تو ابو طلحہ کے جوش
فدویت نے آپ کو یہ کہہ کر روکا۔

لاتشرن یصیبک سہم	آپ سر اٹھا کر نہ دیکھئے۔ ایسا
من سہام القوم نحری	نہ ہو کہ آپ کے کوئی تیر لگ جائے۔
دون نحرک	ابھی تو میرا سینہ آپ کے لئے سپر
(بخاری)	ہے۔

گڑ ماسکی اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا۔

یَا مُوْسٰی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (۵: ۲۴)	اے موسیٰ! جب تک وہ طاقتور روگ بیت المقدس میں لڑنے کے لئے موجود ہیں ہم کبھی بھی اس میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتے تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور لڑو ہم اسی جگہ بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھیں گے۔

لیکن عرب کی کبھی شکست نہ کھانے والی طاقت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھیک ٹھیک ایسے ہی موقع پر جواب دیا تھا۔

لَا نَقُوْلُ كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوْسٰی اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا وَلٰكِنَّا نُقَاتِلُ عَنْ يَّمِيْنِكَ وَعَنْ شِمَالِكَ وَبَيْنَ يَدَيْكَ وَخَلْفَكَ۔ (بخاری)	یا رسول اللہ! ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ کو دیا تھا کہ تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور لڑو بلکہ ہم آپ کے آگے، آپ کے پیچھے، غرض ہر طرف سے جمع ہو کر اور قدم بقدم ہو کر لڑیں گے۔ اور اپنی جانوں کو آپ پر نثار کریں گے!

در اصل یہی وہ اختلاف حالت ہے جس سے "امت مسلمہ" اور "خیر الامم" اور "شہداء علی الناس" کی حقیقی خصوصیات واضح ہوتی ہیں، اور یہی وہ خصائص ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو "مغضوب علیہم" یعنی یہود، اور "الضالین" یعنی

کو چھوڑ کر ملاہی و لعب ہی میں مشغول ہو جاتی ہے۔

اسلام جن اولوالعزم بزرگوں کی ذات پر نازل کرتا ہے، وہ وہی لوگ تھے جو نوعِ روح کو زندہ کر کے خود فنا ہو گئے۔ چنانچہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ جس قدر یہ روح پژمردہ ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں میں عیش پرستی کا میلان ترقی کرتا گیا۔ مسلمانوں کو بغداد کے تمدن و علوم و فنون پر بڑا ناز ہے۔ لیکن وہ بھی سلاطین کی بزمِ طرب کا ایک گلدستہ تھے۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی فخر کی چیز نہیں بلکہ ایک چیز ہی جو امام بخاری نے صحراؤں کا سفر کر کے حاصل کی، در اصل ان تمام علوم سے بدرجہا زیادہ بیش قیمت ہے۔

۴

شخصی حالتوں میں اگر ایک شہری پر کوئی شخص حملہ کر دے تو پولیس اس کی حفاظت کرے گی۔ لیکن اگر اسی شخص کو میدانِ جنگ میں کھڑا کر دیا جائے تو اس کو صرف اپنی ہی حفاظت نہیں کرنی ہوگی، بلکہ وہ دوسروں کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ میدانِ جنگ سے فرار اسی بنا پر عار بلکہ جرم خیال کیا گیا ہے۔ انسان کو جو جذبہ اپنے ساتھ دوسرے کی اعانت و تعاون پر آمادہ کرتا ہے اسی کا نام حمیت ہے وہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے لیکن جماعتی

۳

محاسن اخلاق میں باہم ایک سلسلہ ربط و اتحاد کا ہوتا ہے۔ اس لئے ایک خلق دوسرے خلق کو پیدا کرتا ہے۔ اگر ایک شخص میں فیاضی کا مادہ ہے تو وہ فطرۃً رحم دل اور رقیق القلب بھی ہوگا۔ اگر کوئی شخص بخیل ہے تو سنگدلی اس کے لئے لازمی ہے۔ یہی حال شجاعت و بزدلی کا بھی ہے ان کے نتائج و آثار صرف میدانِ جنگ ہی میں نظر نہیں آتے۔ وہ ایک سلسلہ اخلاق پیدا کر دیتے ہیں، جس کا اثر ملک و قوم کی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ ایک جنگ جُو اور بہادر قوم بالطبع اولو العزم، بلند حوصلہ، باضابطہ مشقت پسند، اور فیاض طبع ہوتی ہے اس لئے وہ اولو العزمانہ سیر و سیاحت کرتی ہے علمی تحقیقات میں مختلف ملکوں کی خاک چھانتی پھرتی ہے، فقر و فاقہ اس کے عزم و ارادہ میں خلل انداز نہیں ہو سکتے۔ وہ اپنی دولت کو مفید کاموں میں بے دریغ صرف کرتی ہے لیکن بزدلی انسان میں عورتوں کی خصوصیات پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے غیر جنگی اقوام فنون لطیفہ کی طرف اپنا میلان ظاہر کرتی ہیں رقص و سرود میں ان کو لطف آنے لگتا ہے۔ شب و روز عیش لپندی میں مصروف رہتی ہیں۔ جامہ زیبی ان کی فطرت بن جاتی ہے۔ تمام ضروری کاموں

ہو جاتی ہے وہ ایک قوم کے اخلاق و عادات کو محفوظ رکھتی ہے اور اس کو کسی دوسری قوم میں مدغم نہیں ہونے دیتی۔ شجاعت اگرچہ بجائے خود ایک جوہر ہے، لیکن عصبیت اس کو جلا دیتی ہے، اور اس کے ذریعہ متعدد قطرے باہم مل کر سیلاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہی ہے جو میزانِ عدل کو قائم رکھتی ہے اور وہی ہے جو ظلم و جور کا مستحق ہے انکار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں ربط و اتحاد اور تعاون و تناصر کا مادہ نہیں ہوتا۔ اور اس کی جگہ خود غرضی، تفرقہ، شقاق، اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، اور ان میں جنگ کے ہی ذریعہ عصبیت پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس طرح یکایک ایک اتحاد علم ہر طرح کے اختلافوں کو مٹا کر نابود کر دیتا ہے۔ اسلام نے ولولۂ جہاد سے عرب کی ان تمام مختلف جماعتوں اور مختلف نسلوں کو ایک کر دیا تھا جو آگے مل کر اور تمدن کا امن پا کر ایک نہ رہ سکے، اور باہمی جنگ و جدال شروع ہو گیا۔ بسمارک نے صرف اسی لئے صدہا مکر و فریب کر کے جرمنی و فرانس کی پچھلی جنگ پیدا کی تھی۔ اور موجودہ جنگ نے انگلستان اور آئرلینڈ کے اختلاف اور سول وار کو جس طرح مٹا دیا، وہ سب کے سامنے ہے!

۵

جنگ جو اور بہادر قوموں کے جذبۂ محبت کی حالت تمام دنیا سے

بھائی کی مصیبت نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا باپ کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا۔

لیکن عصبیت کا کامل ظہور صرف زمانۂ جنگ ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں ہمیشہ امن وسکون کی زندگی بسر کرتی ہیں، ان میں بہت کم عصبیت پائی جاتی ہے۔ ایک متمدن شہری باشندے کو اپنے بھائی سے زیادہ پولیس پر اعتماد ہوتا ہے۔ لیکن ایک وحشی انسان پولیس کی اعانت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لئے وہ خود ہی اپنی حفاظت کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی قوم کی اعانت پر آمادہ رہتا ہے۔

متواتر جنگ جذبۂ عصبیت کو ابھارتی رہتی ہے، اور متصل امن وسکون اس آگ کو بجھاتا رہتا ہے، اسی لئے جو قومیں جنگجو ہوتی ہیں، ان میں شدت کے ساتھ عصبیت پائی جاتی ہے، لیکن جن قوموں کو میدانِ جنگ میں جانے کا موقع نہیں ملتا ان میں یہ روح بہت کم باقی ہے۔ ایک متمدن شخص میدانِ جنگ کے اندر اپنی حفاظت میں مصروف رہے گا۔ لیکن ایک جنگجو قوم کا فرد اپنے بھائی کی حفاظت کو اپنی ذات پر مقدم رکھے گا۔ اس قسم کی عصبیت اگرچہ حقیقی طور پر متحد النسب لوگوں میں پائی جاتی ہے، لیکن معاہدے اور مختلف سیاسی تعلقات کے ذریعے سے دو حلیفوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ مصنوعی عصبیت زمانۂ جنگ ہی کے لئے پیدا کی جاتی ہے۔

عصبیت اپنے اندر محاسنِ اخلاق کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہے۔ وہ خود غرضی کو بالکل مٹا دیتی ہے، ایثارِ نفس کی تعلیم دیتی ہے۔ وہ انسان میں چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے۔ اور ایک فرد کی آواز پر تمام قوم کھڑی

برابری نہیں کر سکتی!

فعالنھا ویجزینی بما صنعت یخ

وقمت الیہ باللجام میسرا

اور جب میں آمادۂ جنگ ہو کر اس کے منہ میں لگام چڑھاؤں گا تو اس

وقت وہ میری اس حُسنِ خدمت کا معاوضہ ادا کر دے گا۔

اس کو سب سے زیادہ اپنی قوم محبوب ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے

ذرا سے اشارہ پر اپنی جان دے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

فی النائبات علی ما قال برھانا

لا یسألون اخاھم حین یندبھم

جب ان کا بھائی ان کو فریاد رسی کے لئے بلاتا ہے تو وہ اس سے دلیل نہیں

پوچھتے بلکہ معاً بجلی کی طرح اندھا دھند ٹوٹ پڑتے ہیں!

وہ اپنے بچے کو اس نظر سے پیار نہیں کرتا کہ وہ اس کے باغِ زندگی کا

گل و ریحان ہے، بلکہ صرف اس لئے کہ اس کی قوم کا ایک قوی البنیہ،

صحیح الجسم، اور بہادر سرفروش فرد ہے، اور اس لئے وہ بڑا ہو کر خود

اس کے لئے نہیں، بلکہ اُس کی محبوب و مطلوب قوم کے لئے ایک مفید

وجود ہو گا۔

فانی احب الجون ذا المنکب العمم

وان عوارا ان یکن غیر واضح

میرا بیٹا عرار اگرچہ گورا چٹا نہیں ہے لیکن میں تو اس کالے کلوٹے کو محبوب رکھتا

ہوں، جس کے شانے لمبے، چوڑے، اور قوی ہیں۔ یعنی قوم کی خدمت و نصرت کے لئے

حسن و رعنائی نہیں، طاقت و توانائی کی ضرورت ہے۔

اگر کبھی صغیر السن بچے کی پرورش اس کو میدانِ جنگ میں جانے سے روکتی

مخالف ہوتی ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنی، پھر اپنے اہل و عیال کی، اس کے بعد اپنی قوم کی محبت رکھتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے ایک جنگ خواہ شخص اپنی جان کو سب سے زیادہ ارزاں سمجھتا ہے۔ اور اس لئے اپنے آپ کو سب سے پہلے خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ اللہ ایک ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

انا لنرخص یوم الروع انفسنا ولو نسام بہا فی الامن اغلینا

ہم لڑائی کے دن اپنی جانوں کو بہت ارزاں کر دیتے ہیں لیکن اگر امن کی حالت میں ہم سے اُن کا نرخ پوچھا جائے تو وہ بہت ہی قیمتی نکلیں گی!!

وہ عموماً میدان جنگ میں رہتا ہے۔ اس کو اپنی بیوی اور بچوں سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا ہے، اس لئے ان سے بہت کم محبت کرتا ہے۔ ایک بدو گھر میں بھوکا پیاسا آیا اور کھانا مانگا۔ گھر والوں نے اس کو مبارک باد دی کہ تمہارے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے" اور ساتھ ہی بچے کو گود میں رکھ دیا۔ اس نے اپنے بہادرانہ جذبے سے مجبور ہو کر کہا "آ اکلہ ام اشربہ؟ کیا میں اس کو کھاؤں؟ کیا میں اس کو پیوں؟

عرب کا ایک بہادر اونٹنی کا تمام دودھ اپنے گھوڑے کو پلایا کرتا تھا۔ اسے اپنے اہل و عیال کی کچھ پروا نہ تھی۔ اس کی بی بی نے شکایت کی تو اس نے معذرت میں یہ شعر کہے۔

تلوم علی ان امنح الورد لقحۃ وما تستوی والورد ساعۃ تفزع

میری بی بی مجھے اس بات پر ملامت کرتی ہے کہ میں اونٹنی کا تمام دودھ اپنے گھوڑے وردنامی کو پلا دیتا ہوں۔ حالانکہ لڑائی کے وقت وہ درد کی

ہیں، اور اسی ملک میں نکاح وازدواج کا سلسلہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔ اب جو اولاد ہوتی ہے اس کی رگوں میں خالص خون نہیں ہوتا۔ وہ دو عنصروں سے مرکب ہوتی ہے اس طرح بتدریج اختلاط نسب ہو جاتا ہے اور چند پشتوں کے بعد فاتح کا اصلی نسب نامہ بالکل گم ہو جاتا ہے۔

اس اختلاط نسب کا صرف یہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ ایک خاندان اپنے نام ونشان کو کھو دیتا ہے، بلکہ اس قبیلہ، اس خاندان، اور اس ملک کی تمام مخصوص اخلاقی خصوصیات ہوجاتی ہیں اور اُن کی جگہ ایک نیا نظامِ اخلاق پیدا ہوجاتا ہے اگر دنیا میں نسلی اور وطنی امتیازات کوئی مفید جوہر ہیں تو جنگی زندگی کی وسعت کا بلاشبہ یہ نقص ہے، لیکن اگر انسان کے لئے چاہیئے کہ وہ تمام کرۂ ارضی کو اپنا وطن اور تمام انسانی نسلوں کو اپنا گھرانا سمجھے، تو پھر یہ انسان کی وہ مشکل ترین متاع مطلوب ہے جو صرف جنگ ہی روشنی میں مل سکتی ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ مفتوح قوم پر ہمیشہ فاتح کی وضع، لباس، اخلاق وعادات کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ازدواجی تعلقات کی حالت میں ہمیشہ مفتوحہ قوم کی بی بی، فاتح شوہر پر غلبہ حاصل کرلیتی ہے۔ اور اس کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔

اہل عرب جب تک حدود عرب میں باہم سرگرم کارزار رہے، ان کا نسب ونسب کے ساتھ ان کا نظامِ اخلاق بھی محفوظ رہا۔ لیکن ابتدائے اسلام میں جب ان کے فاتحانہ حوصلوں نے حدود حجاز میں سے باہر قدم رکھا، تو دفعتاً ان کی تمام عربی خصوصیات معدوم ہوگئیں۔ عرب جاہلیت کا سب سے بڑا مایۂ

ہے تو اُس کو نہایت افسوس ہوتا ہے۔

لولا بنیات کزغب القطا ۷ ردون من بعض الی بعض

اگرچہ یوں کے بچے کی طرح میری چھوٹی چھوٹی لڑکیاں نہ ہوتیں جن کی پرورش
میرے بعد میرے رشتہ داروں میں بمشکل ہوگی تو

لکان لی مضطرب واسع فی الارض ذالطول والعرض

میرے لئے ایک فراخ میدان لمبی چوڑی زمین میں ہوتا، اور وہاں میں آزادنہ
اپنی قوتوں کی نمائش کرتا۔

وانما اولادنا بیننا اکبادنا یمشی علی الارض

ہمارے بچے ہمارے لختِ جگر ہیں، جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔

۶

یہ اخلاقی جزئیات تھے۔ ان کے علاوہ کلی طور پر بھی جنگ ایک قوم کے نظامِ اخلاق کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا سلسلۂ اخلاق قائم کر دیتی ہے۔ جنگ کی وجہ سے انسان اپنے وطن سے نکل کر دوسرے ملکوں کے حدود میں قدم رکھتا ہے۔ اور فاتحانہ ثمرات کی حرص اور ظفرمندانہ جاہ و اقتدار کا ولولہ اس کو وہیں روک لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے اور اسی ملک کے رسم و رواج کا پابند ہو جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ تعلقات بڑھنے

بن گئے۔ جنھیں اس بحث کو ہم ابھی نہیں چھیڑیں گے۔

۲

لیکن فاتح ایک دوسری حیثیت سے مفتوح قوم کے اخلاق و عادات پر بڑا اثر ڈالتا ہے۔ انسان صرف قوت ہی کے آگے سر جھکاتا ہے، اس لیے جب کوئی قوم اس پر غالب آ جاتی ہے تو اس کو لامحالہ اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے رفتہ رفتہ یہی خوش اعتقادی اس کو فاتح کی تقلید پر مجبور کرتی ہے، اور وضع، لباس، اخلاق، عادات، نشست، برخاست، غرض ہر چیز میں فاتح ہی کے نقش قدم پر چلتا ہے اور اس طرح ایک عظیم الشان تمدنی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں سینکڑوں واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے سیلاب نے بہت سی قوموں کو دفعتاً بالکل بدل دیا۔ ہندوستان میں ہیٹ کے نیچے جو چھپے ہوئے سرگشتۂ غرور و تفرنج و فرنگی مآبی میں بدمست نظر آتے ہیں، جب ان کو ہوش آئے گا تو معلوم ہوگا کہ وہ عقل و بصیرت کی جگہ ایک ایسا ذلیل ترین دماغ رکھتے ہیں، جو درپردہ اپنے ضعف اور دوسری قوموں کی قوت کا مہلک اعتراف کر رہا ہے۔ بلکہ یہی انجذاب قومی ہے۔ جو ان کی جبین نیاز کو اکثر ان کی چوکھٹ پر جھکا دیا کرتا ہے

فخریہ تھا کہ وہ اپنے نام و نسب کو ازبر یاد رکھتے تھے، اور اپنے آپ کو فخریہ اپنے
قبیلہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ جب فتوحات اسلامیہ کا سیلاب دوسرے
ملکوں کی طرف بڑھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اختلاط نسب کا خطرہ پیدا ہوا
انہوں نے اہل عرب کو سخت تاکید کی کہ اپنے نام و نسب کو یاد رکھو، اور ملک
کے دیہاتی لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان سے ان کا نام و نسب پوچھا جاتا ہے تو اپنے
گاؤں کا نام بتاتے ہیں۔ لیکن فطرت سے کون جنگ کر سکتا ہے؟ آخر کار اختلاط
نسب ہوا اور قبیلے کے بجائے اب قومیں اپنے مقامات کی طرف منسوب ہونے
لگیں جہاں جنگ کی ضرورت اور سرحدوں کی حفاظت کے لئے وہ مقیم رہتی
تھیں۔ عربی میں ایسی فوج کو جند کہتے ہیں۔ اسلام کے مفتوحہ ممالک کے نقشے میں
متعدد نام انہی انتساب کے ساتھ مشہور ہیں۔ مثلاً جند دمشق، جند عواصم، ان
ناموں نے اگرچہ عرب کی فوجی طاقت کے مستقل اثر کو اب تک زندہ رکھا ہے،
لیکن اس ترکیب اضافی نے آگے چل کر عرب کے نام و نسب کو بالکل مٹا بھی دیا،
اور نسب صریح جو نسلی اخلاق کی محافظت کرتا ہے، وہ بالکل معدوم
ہو گئے۔

یہ ایک نہایت اہم دینی و اجتماعی بحث ہے کہ اسلام نے عرب جاہلیت
اور تمام اقوام عالم کی نسلی حیثیت کو مٹا کر ایک عام اور بین المللی برادری
قائم کی، لیکن اس کے ساتھ ہی جس قدر عمدہ خصائص و نسلی زندگی میں ہو سکتے
ہیں ان سب کو مذہبی رابطہ قائم کر کے مذہب کی بنا پر ابدی کر دیا۔ اور اس
طرح وہ عمدہ خصائص قومی و ملکی حدود سے نکل کر انسانیت کا عام جوہر

بداخلاقیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ فوج ایک مدت تک گھر سے باہر میدانِ جنگ میں اقامت گزین رہتی ہے، زمانۂ جنگ میں اس کے جذبات و قوا سخت ہیجان کی حالت میں رہتے ہیں، بدامنی اس کو بہت کچھ مطلق العنان بنادیتی ہے، اس لئے اس کے جذبات بہیمیہ سخت مشتعل ہوجاتے ہیں، اور وہ اس آگ کو ہر ممکن طریقے سے بجھانا چاہتی ہے، پس مفتوح قوموں کی ہر چیز حالتِ جنگ میں مباح ہوجاتی ہے عرب میں متعہ کا رواج اسی لئے ہوگیا تھا جس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم نے بتدریج مٹادیا۔ ایرانیوں میں عشق رجال کا رواج انہی غلاموں کے ذریعہ سے ہوا جو لڑائیوں میں گرفتار ہوکر آتے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کرلی کہ فارسی لٹریچر کا ایک جزو لاینفک بن گئے، جن کو اگر علیحدہ کردیا جائے تو فارسی شاعری کا دامنِ حُسن و فعتاً خالی ہوجائے!

ابتداء میں اہلِ عرب اس مرض سے بالکل ناآشنا تھے، یہی وجہ ہے کہ قدیم عربی شاعری کا دامن اس داغ سے بالکل پاک نظر آتا ہے۔ لیکن جب اہل عرب کی فتوحات کا سیلاب بڑھا اور اسلام کے دامن میں بھی حلقہ بگوش غلام آئے تو ابتداء میں فوجی خیموں کے اندر ان کو دخل ہوا۔ پھر خلفائے عباسیہ کی بزم طرب کے شمع و چراغ ہوگئے، یہاں تک کہ ابن معتز عباسی نے عربی شاعری کے دامن پر بھی اس داغ کو لگادیا۔

عیش پرستی کی یہ آخری سرحد ہے، اور یہیں پہنچ کر ہر قوم فنا ہوجاتی ہے آج جو لوگ عظیم ترین قوموں کی موت پر ماتم اور نئی قوموں کی شاندار زندگی پر تعجب کرتے

یہ انقلاب اگرچہ بظاہر اپنے اندر بہت سی خوبیاں بھی دکھلاتا ہے، یعنی فاتح قوم کے دل و دماغ جن اعلیٰ جذبات سے لبریز رہتے ہیں، مفتوح قوم بھی انھیں کو جذب کرنا چاہتی ہے، لیکن سیلاب جب آتا ہے تو گوہر و مرجان سے زیادہ اپنے ساتھ خس و خاشاک کا ڈھیر بہالاتا ہے اور اپنی یادگار میں اسی کو چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے۔ زمین کے حصے میں صرف یہی ڈھیر آتا ہے اور ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جو صرف گوہر و مرجان سے اپنے دامن و جیب کو بھر لیتے ہیں۔

فاتحانہ حیثیت سے اخلاقی و تمدنی انقلاب بھی بالکل اسی طرح اضطراری طور پر ہوتا ہے، اس لئے انسان کی قوت انتخاب بالکل بے کار ہو جاتی ہے، اور فاتح جو کچھ دیدیتا ہے، اسی کو جبراً قبول کر لینا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح قوموں کی تقلید میں سینکڑوں غیر ضروری، غیر مفید، بلکہ مضر چیزیں اختیار کر لیتی ہے۔ اور خس و خاشاک کے ڈھیر میں صدف و گوہر بالکل چھپ جاتا ہے۔

فاتح قوم کی جو خوبیاں مفتوح قوم میں منتقل ہوتی ہیں ان کا اثر صرف چند مخصوص افراد ہی میں نمایاں ہوتا ہے، ہندوستان میں کوٹ پتلون پہن کر چلنے پھرنے والے ہر سڑک پر نظر آسکتے ہیں، لیکن انگریزوں کا سا اعلیٰ کیریکٹر اور قومی حریت تعلیم یافتہ لوگوں میں یکسر مفقود ہے۔

جنگ کے ذریعہ سے بعض اوقات فاتح قوم میں نہایت شرمناک

نیند کی حقیقت

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (۷۸: ۱۰)

اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کا وظیفہ طبیعیہ مختلف ہے، آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتا ہے، ہاتھ چھوتا ہے، ناک سونگھتی ہے، زبان چکھتی ہے، دماغ سوچتا ہے وغیرہ وغیرہ انہی وظائف کے اختلاف سے ان اعضاء کے ملذذات و مرغوبات میں بھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ آنکھ خوش رنگ پھولوں سے لطف اٹھاتی ہے۔ کان کو نغمہ ہائے شیریں خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ہاتھ نرم اور ہلکی چیز سمیٹنا چاہتا ہے۔ ناک کو بوئے خوش سے مسرت و حظ ہوتی ہے زبان کو غذائے لطیف سے ذوق ہے۔ دماغ خیال خوش کن خیالات سے جی بہلاتا ہے لیکن ہر و سکون اور آسائش و راحت خدا کی ایسی نعمتیں ہیں جن کے ساتھ تمام اعضاء کو یکساں دل بستگی ہے

ہیں۔ ان کو صرف مادی طاقت ہی پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے، بلکہ ان اخلاقی تغیرات
کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے جو سلطنت عامہ کے جزو لاینفک ہیں۔ اس طرح کی حکمت
نگاہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ترقی و تنزل صرف اخلاقی انقلابات کا نتیجہ ہیں۔ اکثر
زبردست طاقت کے سامنے مادی قوت نے ہمیشہ سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ عرب
کو اسی اخلاقی طاقت نے ابھارا تھا اور اسی کے تنزل نے ان کو موجودہ گمنامی تک
پہنچا دیا۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

ان فی ذالک لآیات لقوم یؤمنون۔ (۲۷ : ۸۶) دسکون پائے۔ پر دن کو روشن کیا تاکہ وہ سکونی نہ بلکہ حرکت میں بسر ہو۔ بلا شبہ اربابِ ایمان و یقین کے لئے اس اختلافِ لیل و نہار اور اس کے اثرات میں حکمتِ ربانی کی بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

حقیقتِ نوم

"ضرورت اختراع و ایجاد کی ماں ہے" اس نے انسان کا دماغ ہمیشہ اپنے راحت و آسائش کے علل و اسباب کی جستجو میں سرگرم رہتا ہے۔ ادویہ وغیرہ کے خواص و اثار اسی ضرورت نے دریافت کئے۔ اکتشافات مدینہ کے گنجینۂ پنہاں کی وہی کلید بردار ہے۔ زمین کے نشیب و فراز کو اسی کو ہموار کیا کل جو جنگل تھا وہی آج باغِ ارم نظر آتا ہے۔ کل جن میدانوں میں درندوں کے بھٹ تھے، آج وہی متمدن انسانوں کا مسکن ہے! دریا کی سطح جو کل تک تلاطم خیز طوفان برپا کر رہی تھی، آج انسان نے خود اس کو مسخر کر لیا ہے! کل تک جو چیزیں پردۂ غیب کا چھپا ہوا راز سمجھی جاتی تھیں۔ آج وہ افسانۂ بزم و انجمن ہیں! لیکن یہ عجیب بات ہے کہ "نیند" کی حقیقت اور اس کے علل و اسباب کا قلعہ ضرورت کی اس ناتمامانہ عقیدہ کشائی سے اب تک محفوظ ہے۔ جس طرح وہ

بظاہر انسان کے بعض متیقظ (بیدار) اعضاء ہمیشہ اپنے وظائف میں سرگرم عمل رہتے ہیں، دل ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ شرائین کی حرکت ہمیشہ جسم میں تر و تازہ خون پہنچایا کرتی ہے۔ آلاتِ تنفس کبھی معطل نہیں رہتے لیکن درحقیقت ان کو بھی آرام و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ نبض کا ہر وقفہ دل کے غیر منقطع سفر کی منزل ہے جہاں وہ آرام لیتا ہے۔ شرائین کے اعمال بھی ہمیشہ تک سرگرمی کے ساتھ جاری نہیں رہتے بلکہ ان میں بھی کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے؛ اور اس وقت ان نازک رگوں کی دوڑ دھوپ بھی خدا کے اس فیضِ عام سے متمتع ہی ہوتی ہے!

نیند اسی حد وتام اور سکون کامل کا نام ہے، اس لئے وہ اعضاء انسانیہ میں ہر عضو کو محبوب ہے، اور اس قدر محبوب کہ اس کے لطف و وصل کو رشک و رقابت منغص نہیں کر سکتے، پس اس سے ہر عضو ایک ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بستر خواب سے اٹھنے کے بعد تمام قواء جسمانیہ کی تجدید ہو جاتی ہے۔ جسم کے جو پرزے چلتے چلتے گھس گئے تھے، وہ اپنی اصلی حالت پر آجاتے ہیں۔ اور تمام اعضاء ایک مسرتِ تازہ، ایک نشاطِ نو، ایک انبساطِ جدید سے مسلح ہو کر اپنے وظائفِ طبیعیہ کے لئے از سرِ نو تیار ہو جاتے ہیں۔

الم یروا انا جعلنا الّیل لیسکنوا فیہا والنہار مبصرا۔	کیا حکمت و ربوبیت کی اس نشانی کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے تاریکی کو تو رات قرار دیا، تاکہ انسان سوئے اور راحت

ثابت ہوتا ہے کہ نیند کی حالت میں دماغ کی معمولی مقدارِ خون بھی کم ہو جاتی ہے۔

ایک شخص بچپن کے زمانے میں سر کے بل گر پڑا تھا۔ ہڈی کے ٹوٹنے سے اس کی پیشانی پچک گئی تھی لیکن جب وہ سوتا تھا تو اس کی پیشانی کا پچکا ہوا حصہ اور بھی گہرا ہو جاتا تھا اور جاگنے کے بعد ابھر آتا تھا۔ پس اگر دماغ حالتِ خواب میں بہ نسبت بیداری کے خون کی غیر معمولی مقدار سے لبریز ہوتا تو نتیجہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔

زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں ہر شخص معمولی حالتوں میں اس کے خلاف تجربہ کر سکتا ہے۔ انسان اکثر گھنٹوں چت لیٹا ہے۔ اس حالت میں نہ اس کو نیند آتی ہے اور نہ دماغ میں کسی جدید کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالتِ خواب میں دماغ خون کے معمولی حصۂ رسدی سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ خون ہی دماغ کی غذا ہے جس سے وہ عمل کرتا ہے۔ اسی کی حرارت کے ذریعہ فضلاتِ دماغیہ کو تحلیل کر سکتا ہے۔ اس لئے خون کی اس قلتِ مقدار کی وجہ سے نہ تو اس کو خود خون کے اجزا میں کسی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ وہ اس کے ذریعہ فضلات ہی کو دفع کر سکتا ہے۔ بلکہ بالکل بے کار ہو جاتا ہے اسی تعطلی دکاری کا نتیجہ نیند ہے۔

لیکن درحقیقت یہ خیال بھی قابلِ وثوق نہیں تجارب سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے کے ساتھ ہی دفعتًہ انسان کے دماغ میں معمولی مقدار سے زیادہ خون

اس وقت غیر متعین تھے جب ایک وحشی انسان غفلت کی نیند سو رہا تھا اسی طرح وہ اب بھی مجہول و مشتبہ ہیں جب کہ ایک متمدن انسان اکتشافات و اختراع کی دھن میں رات رات بھر جاگا کرتا ہے۔ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

زمانۂ قدیم میں اس کی جستجو بے کار تھی کہ وہ خواب غفلت کا زمانہ تھا۔ لیکن اس بیداری کے زمانہ میں بھی اب تک اس کی کوئی تسکین بخش تحدید نہیں کی گئی حالانکہ دور حاضر کے تمام دانشوروں نے اس کے متعلق جو کچھ تحقیق و تفتیش کی ہے وہ ان کے ظن و تخمین سے زیادہ قابل وثوق نہیں ہے۔ تاہم عنوان مقصود کا ایک اہم جزو ہونے کی وجہ سے جستجو کی رہنمائی کر سکتا ہے اس لئے ہم کو افسانۂ خواب و خیال سے کم از کم لطف سماع تو ضرور اٹھا لینا چاہئیے

کمیت و کیفیت دموی:-

دور جدید کے بعض علمائے قدیم کا خیال تھا کہ نیند خون کی اس کثرت مقدار کا نتیجہ ہے جس کی رو لیٹنے سے انسان کے دماغ میں دفعتاً پہنچ جاتی ہے خون کی اسی حرارت کا نتیجہ ہے کہ انسان سوتے وقت گرمی کے احساس سے کپڑا اتار ڈالتا ہے۔

لیکن تجاربِ عملیہ اس خیال کی تائید نہیں کرتے، بلکہ اس کے برعکس

داعضاء میں حرکت پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان تعلقات کے منقطع ہونے سے تمام جسم انسانی معطل ہو جاتا ہے۔ اسی کا دوسرا نام نیند ہے۔ لیکن اب تک اس پر کوئی یقینی دلیل قائم نہیں ہوئی ہے البتہ دوسرے علماء نے اس کے قریب قریب یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جن اعصاب کا وظیفہ طبعیہ تمام جسم میں خون کا پہنچانا ہے ان میں اسباب خارجیہ تغیرات پیدا کرتے رہتے ہیں، اور یہی تغیر سے خواب ہوتا ہے، البتہ یہ ضرورت ہے کہ ان اسباب کو عموماً نشاط افزا ہونا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ نرم بستر کے دیکھنے کے ساتھ ہی نیند آجاتی ہے۔ اور شور وغل ہم کو دفعتاً بیدار کر دیتا ہے۔ قصوں کے سننے سے، بستر پر لیٹنے سے بچوں کو تھپکیاں دینے سے اسی لئے نیند آجاتی ہے۔ کیونکہ یہ اسباب اعصاب میں ایک خوشگوار اور لطیف تموج پیدا کر دیتے ہیں۔

درحقیقت اس رائے کا سلسلہ بھی ان لوگوں کے خیال سے جا کر مل جاتا ہے جو دماغ میں خون کی کمی کو نیند کا سبب قرار دیتے ہیں کیونکہ ان تمام موثرات خارجیہ سے اعصاب میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوتا ہے جو دوران خون کی سرعت کو کم کر دیتا ہے۔ لیکن ان تمام مذاہب کا رد اس نے خون کی کمیت وکیفیت کو نیند کی علت قرار دیتے ہیں، ایک دوسرے عملی تجربے سے کر دیا ہے۔ شام میں دو توام بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک بیدار رہتا تھا اور دوسرا اسی حالت میں سوتا تھا، حالانکہ دونوں کے خون کا ظرف ایک دوسرے سے متصل تھا۔ اگر خون کی کمیت وکیفیت اس کا سبب ہوتی تو دونوں کی حالت خواب وبیداری میں ضرور تلازم ہوتا۔

کی ایک رو پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیند کی حالت میں انسان کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، اور چہرے سے کچھ ظاہری بھی قدر ابھر آتی ہے۔

بعض علماء نے آلات کے ذریعے ایک آدمی کے دماغ میں خون کی مقدار زیادہ پہنچائی اور پھر اس کو معلوم کیا، تو معلوم ہوا کہ نیند پر خون کی کمی و بیشی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

یہ دونوں خیالوں کا دارومدار تمام تر اسی پر تھا کہ نیند کا سبب خون کے مقدار کی کمی و بیشی ہے۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک خون کی مقدار کا کوئی اثر خواب و بیداری پر نہیں پڑتا۔ بلکہ خون کی کیفیت میں جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہی نیند کی علت ہیں۔ کبھی کبھی خون میں اس قدر حرارت اور روانی پیدا ہو جاتی ہے کہ دماغ اس پر قابو نہیں پاتا اور حرارت خون کی وجہ سے دماغ کے اعصاب کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر جو چیز عمل پر آمادہ کرتی تھی وہی اس کو بے کار کر دیتی ہے، اور اسی تعطل کا نام نیند ہے۔

ان علماء نے مختلف علائم و آثار سے اس کی تائید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہی تغیرات دموی کی وجہ سے جب انسان گہری نیند سے اٹھتا ہے تو اس کا چہرہ تمتمایا ہوا نظر آتا ہے اور اس کی جلد میں بھی ایک ابھار سا پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اعصاب کے جال نے تمام اعضاء انسانی کو دماغ کے ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایک خاص کیفیت عصبانیہ دماغ و اعضاء کے ان ارتباطات و تعلقات کو منقطع کر دیتی ہے جو دماغ

کرو ماتو فیل کی کافی مقدار جسم فلایا عصبیہ میں جمع رہتی ہے اور نیند اس خزانے میں اور زیادہ اضافہ کر دیتی ہے۔ لیکن ریاضت شدیدہ اور اعمال شاقہ اس کو فنا کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سخت محنت کے بعد انسان کو نہایت گہری نیند آتی ہے۔

تجارب عملیہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ایک ایسے شخص کے دماغ کا تجربہ کیا گیا جو مدت سے نہیں سویا تھا معلوم ہوا کہ اس کا دماغ کرو ماتو فیل سے بالکل خالی ہے۔

لیکن انسان جب سرگرم عمل رہتا ہے تو صرف یہ اجزاء فنا ہی نہیں ہو جاتے جو دماغ کے انجن کا کوئلہ ہیں، بلکہ جس قدر فنا ہو جاتے ہیں، اسی نسبت سے اس میں فضلات بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں، کوئلہ جس قدر جلتا ہے، اسی قدر انجن میں راکھ بھرتی رہتی ہے۔

حالت عمل بیداری کے اندر اگرچہ دماغ میں اور بھی متعدد قسم کے زہر آلود فضلات پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کی حقیقت اس وقت تک غیر متعین ہے۔ اب تک صحیح طور پر صرف کاربونیک گیس کا علم ہو سکا ہے جو سخت محنت کی حالت میں بکثرت پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بنا پر نیند درحقیقت آکسیجن اور کرو ماتو فیل کی قلت، اور کاربن کی کثرت تولید کا نتیجہ ہے۔

نیند کی حقیقت کے متعلق یہی آخری مذہب ہے جو قابل صحت تسلیم کیا جاتا ہے اور ہمارے روزانہ تجارب بھی بظاہر اس کی تائید کرنے کے لئے تیار ہیں، ہر شخص کو صاف نظر آتا ہے کہ وہ کسان جو دن بھر ہل جوتتا رہتا ہے، اس شہری سے زیادہ

کیمیاوی تحقیق۔

اسی طرح نیند کے اصول و قواعد نے نیند کی جو حقیقت بتائی ہے وہ ان خیالات سے کہیں زیادہ دلچسپ اور وقیع ہے۔ انسان کا جسم درحقیقت ایک انجن ہے جو ہر وقت چلتا رہتا ہے۔ لیکن جب کوئلہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ انجن میں راکھ بھر جاتی ہے تو اس کو مجبوراً رک جانا پڑتا ہے۔ یہی حال انسان کے دماغ کا ہے۔ جب تک اس کو ایندھن ملتا رہتا ہے اور اس میں راکھ نہیں بھرنے پاتی، اس وقت تک اپنے وظائف طبیعیہ میں سرگرم رہتا ہے۔ لیکن جب ایندھن وغیرہ ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ فضلات جمع ہو جاتے ہیں تو انجن کی طرح وہ بھی دفعتاً رک جاتا ہے، اور اسی کو ہم خواب شیریں کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اعصاب دماغیہ اپنے وظائف عملیہ میں ہمیشہ دو چیزوں کے محتاج ہوتے ہیں آکسیجن اور کروماتوفیل۔ اس لئے دماغ آکسیجن کا ایک معتدبہ ذخیرہ ہمیشہ جمع کرتا رہتا ہے، اور جس طرح اسٹیشن پر کوئلہ پانی لینے کے لئے گاڑی ٹھہر جاتی ہے ٹھیک اسی طرح دماغ بھی آکسیجن جمع کرنے کے لئے ایک خاص وقت میں سو جاتا ہے۔ اس لئے نیند درحقیقت اس ٹھہراؤ و استقرار کا نام ہے جس کو انسان کا دماغ اپنے سفر کے لئے کرتا ہے۔

آخرترین تحقیقات

بعض علماء نے اس آخری مذہب پر بھی قناعت نہیں کی اور تحقیق مزید کے لئے دوسرے تجارب بھی جمع کئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے چند کتوں کو ایک مدت تک بیدار رکھا لیکن نہ تو ان کے جسم کی حرارت میں کوئی کمی پیدا ہوئی، نہ کاربون کے اجزاء میں کسی قسم کا اضافہ ہوا اور نہ ہی آکسیجن کی تولید میں کوئی نمایاں فرق نظر آیا۔ خون کی رطوبت اور اس کی کمیت و کیفیت بھی اپنی اصلی حالت پر قائم رہی۔ البتہ دس دن کے بعد کتوں کی یہ حالت ہوگئی کہ ان کے اعصاب بالکل بے حس تھے اور کسی قسم کے اسباب خارجیہ کا ان پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس حالت نے ان کے اعصاب میں ایک ایسا اضطراری تموّج پیدا کر دیا تھا جو کسی دوسرے ذریعہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ سوتے اور پھر بیدار ہوتے تو یہ تموّج عصبی بالکل زائل ہوگیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس دماغی اضطراب کا سبب کیا ہے؟ تکان یا فضلات ردیہ کی تولید؟ اگر اس اضطراری نیند کا سبب خون کی کمیت و کیفیت، اسباب خارجیہ کا اثر، یا وہ فضلات ردیہ ہیں جن کو اوپر کے تمام مذاہب میں نیند کا سبب بتایا گیا ہے، تو ہم ان کو آلات کے ذریعہ دوسرے حیوانات کے دماغ تک پہنچا سکتے ہیں، اور اگر نیند ان کا لازمی نتیجہ ہے، تو ان کو

نیند کا لطف اٹھاتا ہے جو لہو و لعب میں اپنے وقت عزیز کو ضائع کر دیتا ہے۔

لیکن یہ مذہب بھی ابھی تک شکوک و اعتراضات سے خالی نہیں ہے اعمال کیمیاویہ کے نتائج لازمی ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئلہ کے ختم ہوئے اور انجن میں راکھ بھر جانے کے بعد گاڑی فوراً رک جاتی ہے۔ اور پھر اس حالت میں اور کوئی طاقت اس کو نہیں چلا سکتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کو سخت محنت کے بعد بھی اضطراری نیند نہیں آتی حالانکہ دماغ آکسیجن اور کرو ماتو فیل سے خالی ہو گیا ہے اور اس میں کاربون بھر چکا ہے۔ علاوہ بریں سخت محنت کے بعد بھی قصداً جاگنے کی ہر شخص قدرت رکھتا ہے، حالانکہ اعمال کیمیاویہ کا اثر اضطراری ہوتا ہے۔ اس سے بھی قوی تر اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ مذہب صحیح ہے تو اس کا اثر خواب و بیداری کے اوقات پر بھی پڑنا چاہیئے۔ مثلاً اگر ایک شخص آدھی رات کو سویا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے پاؤ گھنٹہ پہلے اس کے دماغ میں آکسیجن اور کرو ماتو فیل کی جگہ کاربون کا وہ ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ جو نیند کا اصلی سبب ہے۔ لیکن اب سونے کے پاؤ گھنٹے کے بعد ہی نیند کاربون کے ان تمام اجزاء کو فنا کر دے گی جو نیند سے پاؤ گھنٹہ پہلے پیدا ہو گئے تھے اور ان کی جگہ آکسیجن اور کرو ماتو فیل کے اجزاء پیدا ہو جائیں گے۔ جو بیداری کی علت ہیں۔ اس بنا پر اس شخص کو پاؤ گھنٹے کے بعد ہی بیدار ہو جانا چاہیئے۔ حالانکہ ہر شخص کا تجربہ اس کے خلاف شہادت دے گا۔

ان تمام مذاہب و خیالات سے ثابت ہو گیا کہ جدید تحقیقات اب تک نیند کی حقیقت اور اس کے علل و اسباب کے تعین میں ناکامیاب ہے۔ لیکن خدا نے اور تمام فطری چیزوں کے ساتھ آج سے تیرہ سو برس پہلے ہم کو اپنا ایک یہ احسان بھی جتایا تھا۔

الم نجعل الارض مهادا والجبال اوتادا وخلقنٰكم ازواجا وجعلنا نومكم سباتا	کیا ہم نے زمین کو آرام گاہ اور پہاڑ کو اس کا کھونٹا نہیں بنایا؟ کیا ہم نے تم کو جوڑا جوڑا نہیں پیدا کیا؟ اور کیا تمہاری نیند کو ایک غافل کر دینے والی چیز نہیں بنایا؟
(۷۸: ۱۰)	

اب تحقیق جدید کا متحرک قدم بھی اسی نقطے پر پہنچ کر رک گیا ہے۔ جہاں سے یہ کار کی حرکت اولی شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ بعض حکماء کا خیال ہے کہ نیند بالکل فطری چیز ہے۔ جس طرح انسان کو کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح وہ نیند کا بھی محتاج ہے۔ اس لئے تمام فطری ضروریات کی طرح اس کے خواص و آثار میں بھی تغیرات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر ایک شخص ریاضت سے کھانا چھوڑ سکتا ہے تو ایک شخص ہمیشہ بیدار بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایک شخص کو غم و الم میں کھانے پینے کی فکر نہیں رہتی تو ایک شخص اس حالت میں خواب بشری کا فسانہ بھی فراموش کر سکتا ہے۔ اگر ایک شخص فاقے سے مر سکتا ہے تو ایک شخص کو دائمی بیداری بھی ہلاک کر سکتی ہے۔ اگر پرخوری کسل پیدا کرتی ہے تو معمول سے زیادہ سونا بھی، اس کا سبب ہو سکتا ہے۔ اگر انسان کو غذا نے

سو جانا چاہئیے۔ حالانکہ تجربہ اُس کی مخالفت کرتا ہے۔
چنانچہ ایک کتے کو چند دنوں تک بیدار رکھ کر اس کے جسم کا خون دوسرے کتے کے جسم میں حقنہ کے ذریعہ پہنچایا گیا۔ اگرچہ اس اختقار سے اس کتے کی دوسرے دماغی کیفیات و آثار میں اختلاف پیدا ہوا لیکن خواب و بیداری پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، اس لئے خون کی کیست و کیفیت نیند کا سبب نہیں ہو سکتی۔
لیکن اس اعتبار پر بظاہر یہ اعتراض ہو سکتا تھا کہ نیند کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے، اس بنا پر تمام جسم کا خون اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے انھوں نے ایک ایسے کتے کے دماغ کا خون جو چند دنوں بیدار رکھا گیا تھا، ایک ایسے کتے کے دماغ میں پہنچایا جس کے اعصاب میں بیداری نے کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں کیا تھا۔ خون پہنچنے کے ساتھ ہی اس کتے کو نیند آگئی۔ اس تجربہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ نیند کا تنبیہ خون یا فضلات ردیہ نہیں بلکہ وہ سیال مادہ ہے جو مبز ادر اعصاب کے اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔
لیکن یہ ہے کہ اس مادہ کی حقیقت کیا ہے؟ قوانین فطرت نے ابھی تک اس راز کو اپنے خزانہ میں محفوظ رکھا ہے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اب تک نیند کی حقیقت ارباب علم کے نزدیک غیر متقین ہے وما اوتیتم من العلم الا قلیلا!

وجعلنا نومکم سباتا

حادثۂ محزنۂ کربلا

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ تاریخ اسلام میں ہمیشہ خون آلود حرفوں میں لکھا گیا، اور اشک بار آنکھوں سے پڑھا گیا ہے۔ لیکن اس درد انگیز واقعہ اور ماتم خیز حادثہ کے اندر شریعت اسلامیہ کی بے شمار تعبیریں مضمر تھیں جن کو خون کی ان چادروں نے چھپا دیا۔ اور ہزاروں اسوہ ہائے حسنہ مخفی تھے جن کو آنسوؤں کے سیلاب بہالے گئے؟

اس لئے اب ہم کو قدیم زمانے کی مجلس ہائے ماتم میں ایک نئے حلقۂ ماتم کا اضافہ کرنا چاہئے۔ اور خون آلود آنسوؤں کو جو چشمہ ہمارے زخم رسیدہ دلوں سے ابل رہا ہے، اس کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کرکے خود واقعۂ شہادت کو اسرار شریعت اسلامیہ کا سرچشمہ بنانا چاہئے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام

لطیف مرغوب ہے تو خوشگوار طنز اس سے زیادہ محبوب ہے۔ غرض یہ ایک

ایسا مذہب ہے جس کے ذریعہ خفیف سے خفیف تمام حواس واعراض کی توجیہ بھی

تعلیل کی جا سکتی ہے اور یہاں شاید قرآن حکیم نے عام موثرات فطرت انسانی

کے سلسلے میں طنز کا ذکر کرکے اس کی طرف ایک بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔

یونانی تہذیب و تمدن کے دیوتاؤں کی یہ نمائش مجسموں کی شکل میں کر رہا ہے
ان کے اندر یونان کی اس قدیم تہذیب کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ہندوؤں
کی مذہبی سطح پر بھی تصویروں کی جو شکلیں نظر آ رہی ہیں ان میں بھی اس کی
جھلک پائی جاتی ہے۔

لیکن اسلام ایک دین خالص تھا جو توحید خالص کو قائم کرنا چاہتا تھا
اور انسانی عظمت کی ان تمام راہوں کا ہمیشہ کے لئے دروازہ بند کر دینا
چاہتا تھا جو کسی حال میں بھی الٰہی عظمت کے نقطہ تک پہنچ سکتی تھیں یا
قریب ہو سکتی تھیں۔ پس وہ کسی طرح بھی قیام ذکر و بقائے عظمت کا ایسا
طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تھا جس پر پڑ کر دنیا بار بار ٹھوکر کھا چکی تھی۔

اسلام نے ظاہر ہوتے ہی دنیا کے تمام اعمال و معمولات پر نظر ڈالی
اور ہر عمل کی حقیقت درج کر لیا اور غیر متناسب و غیر موزوں جسم
نما اس کو چھوڑ دیا۔

وحشت نے جن حقیقتوں کو تاریک پردوں میں چھپا دیا تھا وہ
دفعتہً چاک ہو گئے، جہالت نے جن موتیوں کو پتھروں کے ڈھیر میں گم
کر دیا تھا وہ ان سے الگ ہو کر دنیا کے دامن مراد میں آ گئے۔ غیر معتدل
عقل نے جو غلطی کی تھی۔ بصیرتوں کو خوشنما چادروں کے آب و رنگ میں
راز سے جس طرح مخفی کر دیا تھا وہ یکسر فاش ہو گئے، اور حقیقت
آفتاب کی طرح علانیہ بے نقاب ہو کر ہر انسان کو نظر آئی۔ قرآن حکیم
نے اسی انقلاب کو ان مختصر لفظوں میں بیان فرمایا ہے!

کی شہادت پہ ماتم کرنے کا یہ ایک نتیجہ خیز طریقہ ہوگا اور شریعت نے امت محمدیہ کو اسی قسم کے طریقِ ماتم کی ہدایت فرمائی ہے۔

دنیا میں اسلاف پرستی کا فطری مادہ ہر قوم کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ اسی بنا پر تمام قوموں نے اپنے اسلاف کا ماتم مختلف طریقوں سے منایا ہے اور ان کے اعمال کو آئندہ نسل کی عبرت و بصیرت کے لئے زندہ رکھنا چاہا ہے۔ لیکن ان تمام طریقوں میں جو طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا ہے وہ وہی ہے جس کی بنیاد دنیا کی بت پرستی نے رکھی اور در اصل اصنام پرستی کی زنجیر عمل کی پہلی اور آخری کڑی اسی کو سمجھنا چاہیئے۔ پہلی اس لئے کہ بیشتر اقوامِ انسانی نے اسی راہ سے اصنام پرستی کی منزل پائی اور آخری اس لئے کہ بت پرستی خود تو چلی گئی مگر اپنا نقشِ قدم اس شکل میں اب تک چھوڑ گئی ہے۔

ہمارا اشارہ اسلاف پرستی کے اس طریقے کی طرف ہے جس کی بنا پر مشاہیر ملک و قوم کے مجسمے (اسٹیچوز) بنائے جاتے ہیں اور ان کو اس لئے نصب کیا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ قوم کو ہمیشہ مشاہیر کی یاد دلائی جاتے۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت ملے۔

اگرچہ اسلاف پرستی کا یہ نہایت قدیم طریقہ تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک اس قسم کے متعدد مجسمے قائم ہو چکے تھے اور ان کی غلو نیہ پرستش کی جاتی تھی۔ لیکن یونان و مصر نے ان مجسموں پر تمدن و تہذیب کا آب و رنگ چڑھا کر ان کو اور بھی شاندار و دلفریب بنا دیا۔ آج یورپ

کا راہِ عمل ہے۔ اور اس سے ان کے نمونے ہر وقت تمہارے سامنے رہنے چاہئیں (یہ نہایت اہم مقام ہے۔ اس کی پوری تفصیل تفسیر سورۂ فاتحہ میں دیکھنی چاہئے۔ جو سلسلۂ مجلدات البیان فی مقاصد القرآن البلاغ پریس میں چھپ رہی ہے)

پس تمام قوموں نے وحشت کے جن تاریک پردوں کو ڈال کر اصل حقیقت کو چھپا دیا تھا اور تمدن اور تہذیب نے ان پردوں کو منظر فریب رنگ چڑھا کر جس تعبیر تک پہنچا دیا تھا، اسلام نے آکر سب کو چاک چاک کر دیا، اور مغز حقیقت جو چھلکوں میں چھپا ہوا تھا اُن سے نکل کر علانیہ آشکار ہو گئی۔

قرآن حکیم میں انبیائے سابقین کے جو قصص مذکور ہیں، ان کے اندر درحقیقت انہی تعلیمات کی روح مضمر ہے جو رسموں کے قالب میں حلول کر کے بالکل بے اثر اور محض ظاہر فریب ہو جاتی تھی۔ قرآن مجید قدماء و اعاظم رجال کی یادگاروں سے [illegible] کرنے کے اصلی مقصد کو "اسوۂ حسنہ" کے جامع لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور مسلمانوں کو جا بجا اس پر توجہ دلاتا ہے۔ چنانچہ تم بار بار انہی صفحات پر پڑھ چکے ہو کہ اس نے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے نمونۂ حیات کو مسلمانوں کا قبلۂ وجوہ و کعبۂ افتخار قرار دیا۔

قد كانت لكم اسوة حسنة في ابراهيم والذين	تمہارے لئے حضرت ابراہیم کی حیات طیبہ میں، اور ان کی زندگی میں جو ان کے

اللہ ولی الذین امنوا یخرجہم من الظلمات الی النور والذین کفروا اولیاءھم الطاغوت یخرجونہم من النور الی الظلمات ۔ (۲۵۸ : ۲)

خدا مسلمانوں کا دوست اور ساتھی ہے۔ ان کو ہر طرح کی انسانی تاریکیوں سے نکال کر فطرت صالح کی ربانی روشنی میں لاتا ہے، مگر کفار کے دوست ان کے طاغوت ہیں، جو ان کو خدائی بخشی ہوئی روشنی سے نکال کر جہالت و ضلالت کی اندھیری کی طرف لے جاتے ہیں۔

یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا جس کی جھلک اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتی ہے، اور مشاہیر پرستی کرنے کا طریقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ قدماء کی یادگار قائم کرنے اور ان کے اعمال و آثار کے زندہ رکھنے کا جو طریقہ زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا، اسلام نے اس میں بھی ایک روحانی انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کو مجسموں کی شکل میں اسلاف پرستی کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ بت پرستی تک منجر ہوتی ہے اور اسلام زندہ انسانوں کے شرف کو پتھروں کے آگے نہیں جھکانا چاہتا تھا، مگر اس نے مشاہیر کرام اور اسلاف صالحین کے نمونوں کے فوائد عظیمہ کو بھی ضائع ہونے نہ دیا، اور ان کے اثر کو اس طرح پر قائم کر دیا کہ ہر مومن کے آگے ان کے عملی زندگی کے نمونے پیش کر دیئے۔ اور کہا کہ دن میں پانچ بار جب خدا کے حضور آؤ تو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ہدایت مانگو۔ اور اس کی تشریح کر دی کہ صراطِ مستقیم انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین

یہی سبب ہے کہ خاندانِ نبوت ہمیشہ اعزہ و اقارب کی اعانت سے محروم رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک مدت تک شب و روز اپنی قوم کو دعوتِ توحید دی اور قوم نے فرطِ بغض و عناد سے ان کی دعوتِ حق کو رد کر دیا، ان سے علیحدگی اختیار کرلی، اور کانوں میں انگلیاں تک دے ڈالیں۔

قال رب انی دعوت قومی لیلا ونھارا فلم یزدھم دعآءی الا فرارا۔ وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اٰذانھم واستغشوا ثیابھم واصروا واستکبروا استکبارا۔ (۵)

نوح نے عرض کیا! خداوندا! میں نے شب و روز دعوتِ حق کی لیکن اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ لوگ مجھ سے اور زیادہ بھاگنے لگے۔ میں نے جب ان کو تیری مغفرت کے لئے پکارا، انھوں نے کانوں میں انگلیاں ڈالیں۔ اپنے کپڑوں میں لپٹ گئے کہ ان تک تیری آواز نہ پہنچ جائے لیکن آہ! یہ حق ناشناس قوم ہمیشہ سخت ہٹ دھرمی اور باطل پرستانہ تعصب کا اظہار کرتی رہی!

لیکن اس پیغمبرانہ آواز کی صدائے بازگشت صرف ان کی قوم ہی کے در و دیوار سے ٹکرا کر ناکامیاب واپس نہیں آئی، بلکہ خود ان کے گھر کے در و دیوار نے بھی اس کو ٹھکرا دیا اور خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ یعنی ان کے بیٹے نے بھی اس نور کو قبول نہ کیا۔ آخری وقت میں نوح علیہ السلام

معنہ - ساتھی ہیں، پیروی کے لئے بہترین نمونہ
رکھا گیا ہے۔

(۶۰۴)

اس بنا پہ اسلام دنیا کا پہلا مذہب ہے جو اسلاف پرستی کے صحیح اصول پہ اسلامی تعلیم دیتا ہے، اور اسی صحیح اصول کے مطابق چاہئیے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت کے اندر عزم و استقلال، صبر وثبات، استبداد شکنی قیام جمہوریت، امر بالمعروف، و نہی عن المنکر کی جو عظیم الشان تعبیریں موجود ہیں، ان کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھیں، اور کم از کم سال میں ایک بار اس مذہبی قربانی کی روح کو تمام قوم میں جاری وساری کر دیں۔

لیکن ان تعبیروں کے علاوہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات میں ایک عظیم الشان تعبیر بھی موجود ہے، جس کا سلسلہ مذہب کی ابتدائی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کی آخری کڑی اسلام کی تکمیل سے جا کر مل جاتی ہے۔

دنیا کی مذہبی تاریخ کی ابتدا عجیب بے کسی کی حالت میں ہوتی۔ ہم نے دنیا کے سخت سے سخت معرکوں میں باپ کو بیٹے کا شریک، بھائی کو بھائی کا حامی، بی بی کو شوہر کا مددگار پایا ہے۔ لیکن صرف مذہب ہی کا روحانی عالم میں ایسا عالم ہے، جہاں باپ کو بیٹے نے، بھائی کو بھائی نے، شوہر کو بی بی نے چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان کی مصیبتوں میں اور بھی اضافہ کیا ہے۔

ھم اجمعین الا	کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہمارے عذاب سے
من امرأتہ قدرنا انھا	صرف لوطؑ کا خاندان محفوظ رہے گا اور ان میں
لمن الغابرین	بھی ان کی بیوی تمام قوم کے ساتھ عذاب الٰہی
(۵۱، ۵۸)	میں شامل کر لی جائے گی کیونکہ وہ بھی بدذات ہے

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے خاندانِ نبوت میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ان سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بی بی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن دورِ ابراہیمی میں بیٹے نے باپ کی، بی بی نے شوہر کی، بہن نے بھائی کی دعوتِ حق پر لبیک کی صدا بلند کی؛ اور اس دعوت کی اشاعت میں جو جو مصیبتیں ان پر پیش آئیں، ان میں برابر کے شریک رہے۔ سب سے پہلے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس جہاد روحانی کی طرف قدم بڑھایا اور شوہر کے ساتھ اپنے لختِ جگر کو بھی "وادی غیر ذی زرع" میں ڈال دیا، جہاں کئی سو میل تک آبادی کا پتہ نہ تھا۔ یہ اس سخت امتحان کی پہلی منزل تھی جس کے لئے خدا وند تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب کیا تھا۔ چنانچہ جب اس آخری امتحان کا وقت آیا تو انہوں نے باپ کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا۔

فلما بلغ معہ السعی	جب اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم
قال یا بنی انی اری فی المنام	کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو
انی اذبحک، فانظر ماذا	انہوں نے ایک دن کہا: اے بیٹے میں نے

نے پھر اپنے بیٹے کو خدا کی پناہ میں بلایا لیکن اس وقت بھی اس کا گوشِ نصیحت نیوش وا نہ ہوا۔ اس لئے وہ بھی تمام قوم کے ساتھ عذابِ الٰہی کی طوفان خیز موجوں میں بہہ گیا۔

ونادی نوح ابنہ وکان فی معزل: یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکفرین، قال ساوی الی جبل یعصمنی من الماء، قال لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم وحال بینہما الموج فکان من المغرقین۔ (۱۱: ۴۳)	اور نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو اپنی شامتِ اعمال کی وجہ سے ان سے علیحدہ تھا، پکارا کہ اے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا، اور کافروں کا ساتھ نہ دے۔ اس نے کہا میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور وہ مجھے اس طوفان سے بچا لے گا۔ نوح نے کہا تو کس ضلالتِ عقل میں مبتلا ہے؟ آج خدا کے عذاب سے کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ چنانچہ نوح کی پکار کچھ بھی سودمند نہ ہوئی اور

اس کے بیٹے کے درمیان موج حائل ہو گئی۔ اور تمام لوگوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے تمام خاندان نے اگرچہ ان کا ساتھ دیا۔ لیکن خود ان کی بیوی ان سے علیحدہ ہو کر تمام قوم کے ساتھ عذابِ الٰہی میں شامل ہو گئی۔

قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین، الا ال لوط انا	فرشتگانِ عذاب نے کہا ہم اس گناہ گار قوم کو اس کے اعمالِ بد کا نتیجہ دکھلانے

آنس من جانب الطور نارا قال لاهله امکثوا انی آنست نارا لعلی آتیکم منها بخبر او جذوۃ من النار لعلکم تصطلون

کی روشنی نظر آئی۔ انھوں نے اپنی بیوی سے کہا یہیں ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، اس کا پتہ لگاتا ہوں۔ شاید تمہارے تاپنے کے لئے آگ لا سکوں۔

(۲۸ : ۲۹)

سینا وادی (ایمن) میں جا کر معلوم ہوا کہ یہ آگ کا شعلہ نہ تھا بلکہ وہ ایک برق خاطف تھی جو فرعون کے خرمن ظلم و استبداد پر گرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ جب خدا نے عصا اور ید بیضا کی صورت میں ان کو یہ صاعقہ بلائت دیا اور انھوں نے اپنے بھائی ہارون کی اعانت کا سوال کیا، تو خدا نے اس کو پورا کیا۔

قال: سنشد عضدک باخیک ونجعل لکما سلطانا۔

خدا نے کہا میں تیرے دست و بازو کو تیرے بھائی کی اعانت سے قوی کر دوں گا اور تم دونوں کو فرعون پر غالب کر دونگا۔

چنانچہ حضرت ہارون علیہ السلام نے آغاز کار سے انجام کار تک حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا۔ اور وہ دعوت موسوی کے ہمیشہ شریک و امین رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اس سلسلہ کو اور ترقی ہوئی۔ پہلے زمانے ایک صالح بندے نے اپنے بیٹے کو خدا کی مرضی پر قربان کرنا چاہا تھا، لیکن اب وہ وقت آیا کہ خود حضرت مسیح علیہ السلام نے قربانی

ترى ؟ قال يا ابت افعل ما تؤمر ستجدني ان شاء الله من الصابرين فلما اسلما وتله للجبين وناديناه ان يا ابراهيم قد صدقت الرؤيا انا كذلك نجزي المحسنين ان هذا لهو البلاء المبين (۳۷:۹۹)

خواب میں دیکھا ہے کہ گویا تمہیں راہِ حق میں ذبح کر رہا ہوں میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تم بھی اس پر غور کرو کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ بیٹے نے فوراً کہا اے میرے باپ! اس خواب سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ایک اشارہ ہے۔ پس آپ حکمِ الٰہی کو پورا کیجئے۔ مجھے انشاء اللہ صبر کرنے والوں اور ثابت قدموں میں سے پائیے گا۔ جب باپ بیٹے (دونوں) خدا کے آگے جھک گئے اور باپ نے ذبح کرنے کے لئے بیٹے کو زمین پر پچھاڑا تو اس وقت ہم نے آواز دی۔ اے ابراہیم! بس کرو تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم صاحبانِ احسان کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ در اصل یہ ایک بہت ہی بڑی قربانی تھی جس کی تعمیل کے لئے تم تیار ہوگئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت بھی ان کے خاندان کی امانت و رفاقت شریک رہی چنانچہ جب ان کو شعلۂ طور کی زبان نے بشارتِ نبوی دی تو ان کی بی بی ان کے ساتھ تھیں۔ بلکہ انھیں کے لئے وہ آتشکدۂ طور سے آگ لینے گئے تھے۔

فلما قضى موسى الاجل وسار باهله

جب موسیٰ مدت سے اپنی بی بی کو لے کر چلے تو ان کو کوہِ طور کے دامن میں آگ

بالمعروف ونہی عن المنکر ہی کے لئے ہوا کرتی تھیں۔ اس لئے جب اسوۂ ابراہیمی کے زندہ کرنے کا ٹھیک وقت آگیا تو خاندانِ نبوت کے زن و مرد، بال بچے، غرض ہر فرد نے اس میں حصہ لیا۔ اور جن قربانیوں کے پاک خون سے رنگینی کا آغوش اب تک خالی تھی ان سے کربلا کا میدان رنگ گیا۔

پس حضرت حسین علیہ السلام کا واقعہ کوئی شخصی واقعہ نہیں ہے اس کا تعلق صرف اسلام کی تاریخ ہی سے نہیں بلکہ اسلام کی اصلی حقیقت سے ہے۔ یعنی وہ حقیقت جس کا ظہور اسمٰعیل علیہ السلام کی ذات سے ظہور ہوا تھا۔ اور وہ بتدریج ترقی کرتی ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات تک پہنچ کر گم ہو گئی تھی۔ اس کو حضرت حسین علیہ السلام نے اپنی سرفروشی سے مکمل کر دیا۔

خاندانِ نبوت دنیا کے آباد کرنے کے لئے ہمیشہ اجڑتا رہا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھر بار چھوڑا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آوارہ گردی کی، اور نبوتِ محمدی کے متبعین میں سے حضرت حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا کے اندر اس خانہ ویرانی کو مکمل کر دیا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے خاندانِ نبوت کا سلسلہ ملا ہوا ہے۔ انہوں نے ایک وادی غیر ذی زرع میں شدتِ تشنگی سے ایڑیاں رگڑی تھیں۔ حضرت حسین علیہ السلام نے بھی میدانِ کربلا میں اس خاندانی روش کو زندہ کیا۔ اور غالباً یہی مقصود ہے ان مفسرین

کے جامِ مقدس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اور ان کے لئے سولی کا جو تختہ طیار کیا تھا۔ اس کی طرف بلا کسی باک کے بڑھے۔

وما قتلوہ وما صلبوہ ولٰکن شبہ لہم (۴:۱۵۶) — اور ان لوگوں نے نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا، نہ پھانسی دی، بلکہ ان پر اس قربانی کی حقیقت مشتبہ ہو گئی۔

لیکن اسلام کے زمانہ تک خدا کی راہ میں جو قربانیاں ہوتی تھیں، وہ محض شخصی حیثیت رکھتی تھیں۔ یعنی انبیاء نے شخصی طور پر خدا کی ذات پر اپنی اولاد کو یا اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ جہاد کی یہ ابتدا تھی، مگر اس کی تکمیل شریعت اسلام پر موقوف تھی۔ چنانچہ اسلام نے جس طرح جہاد کی حقیقت کو بھی مکمل اور واضح کر دیا۔ اب تک کسی پیغمبر کے خاندان نے جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ شخصی طور پر بھی جو قربانیاں کی گئیں، وہ راہ ہی میں روک لی گئیں۔ حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کو خدا کی نذر کرنا چاہا لیکن اس کا موقعہ ہی نہ آیا، حضرت عیسیٰ سولی کی طرف بڑھے لیکن بچا لئے گئے۔ آج تک تمام خاندانِ نبوت نے متفقہ طور پر اس میں شرکت بھی نہیں کی تھی اور اس کی نظیر تمام سلسلۂ انبیاء میں نہیں نظر آتی تھی کہ صرف بھائی، صرف بیٹا، صرف بیوی ہی نے مقصدِ نبوت میں ساتھ نہ دیا ہو بلکہ بالکثیر خاندانِ نبوت کے اکثر اعضاء و ارکان راہِ حق میں قربان ہوتے ہوں۔

یزید کی شخصی خلافت کی بیعت کے لئے جو ہاتھ بڑھے تھے، وہ اسلام کی جمہوریت کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے، اور مذہب کی قربانیاں صرف امسر

فلسفۂ احتساب

امر بالمعروف والنہی عن المنکر

مظاہرِ مختلفہ و مدارجِ ترقی و تنزل

اللہ تعالیٰ نے مادۂ عالم کی تخلیق و تقویم صرف انسان کی نفع رسانی کے لئے کی ہے۔ جس طرح زمین کا فرش ہمارے لئے بچھایا گیا ہے جس کو ہم پاؤں سے روندتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہوا کا کرہ بھی ہمارے ہی لئے حرکت کر رہا ہے جس کو ہم ہاتھ سے چھو نہیں سکتے۔ جس طرح خاک کا ہر ذرہ ہمارے لئے فضائے عالم میں چمکتا پھرتا ہے، اسی طرح آفتاب بھی ہمارے ہی لئے اپنے محور پر گردش کر کے نور برسا رہا ہے۔ جس طرح ہمارے لئے اعصاب کا باہمی اتصال ہمارے دماغ تک ایک احساس کی کیفیت کو نہایت سرعت کے ساتھ پہنچاتا رہتا ہے اسی طرح تمام اجرام فلکیہ کی قوتِ جاذبہ سب کو ایک رشتہ میں جکڑ کر ان کے متفقہ فوائد و منافع کو ہمارے ہی لئے تقسیم کرتی رہتی ہے۔

امامیہ کا جو "وفدینہ بذبح عظیم" کی تفسیر میں
ذبح عظیم شہادت امام علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس
بارے میں بعض اہل بیت کرام علیہم السلام کے آثار نقل کرتے
ہیں۔

وماخلقنا السماء و الارض وما بینھما لاعبین (۲۳:۱۶)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے محض ایک کھیل تماشہ ہی نہیں بنایا بلکہ ان میں سے ہر چیز اپنے اندر اپنی تخلیق کا ایک خاص مقصد، ایک خاص خاصہ، ایک خاص اثر، اور ایک ممتاز علت رکھتی ہے۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ یہ تمام فوائد و منافع صرف انسان ہی کے لئے مخصوص ہیں، لیکن چونکہ انسان زمین میں رہتا ہے اور اس کے فوائد سے آسانی کے ساتھ متمتع ہو سکتا ہے، اس لئے زمین ہی کے منافع کو خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا۔

ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً۔ (بقرہ ۲:۲۷)

وہ رب السموات والارض ہی تو ہے جس نے زمین کی ہر چیز کو تمہارے لئے پیدا کیا تاکہ تم اس سے کام لو۔

پھر متعدد آیتوں میں تمام بڑی بڑی مخلوقات کی تفصیل بیان فرمائی اور ان کو بھی اپنی ایک نشانی قرار دیا۔

وجعلنا السماء سقفاً محفوظا وھم عن آیاتھا معرضون۔ وھو الذی خلق اللیل والنھار والشمس والقمر، کل فی فلک

اور دیکھو، ہم نے آسمان کو کرۂ ارضی کے اوپر ایک محفوظ چھت کی طرح بنایا، اور کس طرح اس میں سے اپنی حکمت و قدرت اور طرح طرح کے مصالح و اسرار کی نمود کی؟ یہ انسان کی ضلالت ہے کہ باہیں

شؤون مادیہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے اس احسانِ عام کا ذکر بار بار کیا ہے پہلے ایک آیت میں فرمایا کہ آسمان و زمین کی ہر مخلوق اپنے ساتھ فوائد و منافع کا ایک بے شمار ذخیرہ رکھتی ہے، اور خدا کے صالح بندے وہی ہیں جو ہمیشہ اس خزانہ کی جستجو میں مصروف رہتے ہیں:-

ان فی خلق السموٰت	یقیناً آسمانوں اور زمین کی خلقت نیز لیل
والارض واختلاف الیل	و نہار کے اختلاف و طلوع و غروب میں
والنہار لآیات لاولی الالباب	ارباب عقل و بصیرت کے لئے معرفتِ الٰہی
الذین یذکرون اللہ	کی بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں۔ وہ ارباب
قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبہم	بصیرت جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے غرض کہ ہر
ویتفکرون فی خلق السموٰت	حال میں اللہ تعالیٰ کو اور اس کی قدرت و حکمت
والارض ربنا ما خلقت	کو یاد کرتے رہتے ہیں اور کائنات سماوی و
ھذا باطلا	ارضی کے اسرار و حقائق میں ہمیشہ تفکر کرتے رہتے ہیں
(۳: ۱۸۷)	اور بالآخر اس نقطۂ علم و یقین تک پہنچ جاتے

ہیں کہ کائنات عالم کے کسی ایک ذرّے کو بھی خدا تعالیٰ نے بغیر کسی مصلحت و نفع کے پیدا نہیں کیا ہے، اور یہ سب کچھ محض کسی اتفاقی تخلیق و تکوین ہی کا نتیجہ نہیں ہے:

والجبال اوتادا وخلقناکم ازواجا۔ (انبیاء ۱۷)

بچھا دیا؟ کیا یہ ہماری ہی حکمت و قدرت نہیں ہے کہ پہاڑوں کی بلندی کی اور اس پر میخوں کی طرح گڑو کی؟ پھر کیا وہ ہم ہی نہیں ہیں جس نے تم کو دو جنسوں میں منقسم کر دیا؟

مادہ اور قوّت

لیکن دنیا مادہ اور قوت، دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی عمل ان دونوں کی آمیزش کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ نظام وقت کی ہر کڑی اس وقت تک بکھری ہوئی پڑی رہتی ہے جب تک کہ قوت اس میں تنظیم و ترتیب پیدا نہ کرے اور اسی کا نام تکوین ہے۔ پس اس بنا پر خدا نے ان شئوون مادیہ کے ساتھ ہمارے اندر مختلف قوا بھی پیدا کر دیئے، جو مادہ عالم سے فائدہ اٹھانے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم پر جا بجا ان قوتوں کے ذریعہ بھی احسانِ الٰہی جتایا گیا ہے۔

قل ھو الذی انشاکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلا ما تشکرون۔ (رعد: ۲۳)

کہا دو کہ اسی کی ذات خالق کائنات ہے جس نے تم کو پیدا کیا، اور تمہارے اندر حواس باطنی و ظاہری اور ادراک کی قوتیں ودیعت کیں۔

یسبحون۔ (انبیا: ۳۳)

ہمہ اجرام سماویہ کی عجیب و غریب نقشہ سے فلکی گردش ہو رہی ہے، پھر دیکھو۔

اس کے سوا اور کون ہے جس نے رات اور دن کے اختلاف کو زمین کے لئے قائم کیا؟ اور سورج اور چاند کو پیدا کیا جو آسمان میں تیرتے رہتے ہیں؟

اللہ الذی خلق السموٰت والارض وانزل من السماء ماء فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم وسخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہ وسخر لکم الانھار (ابراھیم: ۳۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور اوپر سے پانی برسایا جس کی آبیاری سے تمہارے لئے طرح طرح کی غذائیں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر یہ تو اس پانی کے منافع کی تسخیر تھی جو اوپر سے گرتا ہے لیکن جو پانی تمہارے قدموں کے نیچے بہہ رہا ہے اس کے منافع بھی تمہیں کو بخش دیے، چنانچہ سمندر کی دہشت انگیز قہاری پر اس طرح تم کو مسلط کر دیا کہ تم نے کشتیاں بنائیں اور وہ اس سہولت سے پانی میں چلتی پھرتی ہیں۔ گویا سمندر بھی خشکی کی طرح تمہارا جولان گاہ ہے اور تم اس کے جس حصہ میں جانا چاہو خشکی کی طرح چل کر جا سکتے ہو!

کذلک سخرھا لکم لعلکم تشکرون (حج: ۳۸)

اسی طرح ہم نے تمہارے آگے چارپایوں کو مسخر کر دیا تاکہ تم اللہ کی نعمتوں سے کام لو۔

الم نجعل الارض مھادا کیا ہم نے زمین کو تمہارے لئے ایک فرش کی طرح نہیں

وھدینٰہ النجدین۔ (۹۱) — دیا طل، یمین و شمال کی دونوں گھاٹیاں اسے نہیں دکھا دیں!

اس لئے جس طرح انجن کو ایک سائق (ڈرائیور) کی ضرورت ہوتی ہے کہ سٹیم کی طاقت کو سیدھی راہ پر لگائے، اسی طرح یہ قوتیں بھی ایک ذی شعور محاسب کے محتاج ہوتے ہیں جو ان میں تنظیم و ترتیب، توافق و تطابق اور صحیح و مکوّن فعالیت پیدا کرے۔ اور بالفاظ دیگر یہ کہ اُن سے ٹھیک ٹھیک صحیح و عادلانہ کام لے۔ اس لئے خدا نے ہر چیز کے اندر فطرتاً اس محاسب کو بھی پیدا کر دیا۔

قال: ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ۔ (طہٰ: ۴۰) — میرا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کی تکمیل کی۔ اور پھر اس کو حواس ظاہری و باطنی دے کر راہِ عمل دکھا دیا۔

لیکن انسان کو فطرت نے یہ حصہ اور تمام مخلوقات سے زیادہ دیا ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (والتین: ۴) — ہم نے انسان کو ایک بہترین فطرت عادلہ و مقوّمہ کے قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہی فطرت صحیحہ اور خلقت مستقیمہ ہے جو انبیاء کرام کے اندر سے نمایاں ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ خدا کے اس احسان کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ اور یہی فطرت احسنیہ صالحہ ہے جو اُن کے عصر و دور کی عام تاریکی و ضلالت کے اندر چمک کر حقیقت محبوبہ کا روشن راستہ دکھا دیتی ہے

ان قوتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے کامل وسعت و بسط کی ضرورت تھی۔ اس لئے خدا نے اس احسان کی بھی تکمیل کر دی۔

قل هو الذی ذرأکم فی الارض، والیه تحشرون۔ (الملک: ۲۴)

خدا ہی نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے کہ اپنی قوت سے پوری وسعت کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، اور پھر وہی تم کو اپنی طرف سمیٹ بھی لے گا۔

قوت اعلیٰ و مدبرہ:-

لیکن یہ قوتیں برق و باد اور کہربائیت و دخانیت کی طرح حرکت پیدا کرنے کی تو قوت رکھتی ہیں۔ مگر وہ انسان کو بذات خود منزل مقصود تک نہیں لے جا سکتیں وہ صرف حرکت پیدا کرنا جانتی ہیں، لیکن حرکت کے لئے چپ و راست، یمین و یسار، جنوب و شمال کی تمام راہیں یکساں ہیں وہ راہ متعین نہیں کر سکتی اس لئے یہ قوتیں خود زمین کے نشیب و فراز میں تمیز نہیں کر سکتیں، اور خدا ہی نے ان کو خیر و شر کے یہ دونوں راستے دکھا دیتے ہیں۔

الم نجعل له عینین و لسانا و شفتین و

کیا ہم نے انسان کے لئے آنکھیں، ہونٹ اور زبان بنا کر خیر و شر، حق

اذا جلّٰہا والیل اذا یغشاھا والسماء وما بنٰہا والارض وما طحٰہا، ونفس وما سوّٰہا فالہمہا فجورھا وتقواھا قد افلح من زکّٰہا وقد خاب من دسّٰہا

(والشمس: ۱۰)

مروزِ روشن جو رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر دیتا ہے! رات کی ظلمت جو دن کو روشنی کو چھپا لیتی ہے! آسمان اور اس کی عجیب و غریب بناوٹ! زمین اور اس کا حیرت انگیز پھیلاؤ! اور پھر مادۂ عالم کے ان تمام مظاہر و شئوؤں کے بعد روحِ انسانی اور اس کا وہ خالق مطلق جس نے اس میں ایسی مناسب، موزون، مستقیم، و عادلہ فطرت عالم رکھی، اور بالآخر خیر و شر، حق و باطل، کجی و سقیم، عدل و اسراف، نور و ظلمت دونوں راہوں کو اس پر کھول دیا۔ پس بامراد و کامیاب وجود وہ ہے جس نے اپنی قوتِ مکتسبہ کے عمل سے اپنی فطرتِ صالحہ کو پاک اور بے آمیزش رکھا۔ اور نامراد انسان وہ ہے جس نے اسے ضائع کر دیا!!

اب دیکھو کہ اس سورۂ کریمہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مظاہر و شئوؤں مادیہ سے شہادت دلائی ہے، اس کے بعد نفسِ انسانی کا ذکر کیا ہے، تسویۂ فطری کی طرف اشارہ کیا ہے، آخر میں فلاح و خسران کا معیار بتلا دیا کہ الہامِ خیر و شر کی کشاکش و تصادم میں مستقیم و معتدل رہنا اور فطرتِ صالحہ کو شر کی آمیزش سے پاک رکھنا۔ پس پہلا درجہ مادہ کا ہے، دوسرا قوت کا، تیسرا ان سب سے بالاتر ذی شعور قوتِ مکتسبہ و عالمہ کا۔

یہی آخری جزء، جو مادہ و قوت میں ربط و توافق اور پھر عمل و صرفِ صحیح پیدا کرتا ہے، فی الحقیقت اعتدال کا سنگِ بنیاد ہے اور اسی پر ازبالمعروف

واذ قال ابراھیم لابیہ وقومہ، اننی براء مما تعبدون، الا الذی فطرنی فانہ سیھدین
(زخرف: ۲۵)

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، ایک خدا کو چھوڑ کر تم نے اپنی پرستش کے جو جھوٹے معبود بنا لئے ہیں، میں نے ان سب سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ میں صرف اسی معبود حقیقی کا ہو رہا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا۔ اور چونکہ مجھے پیدا کیا اس لئے صرف وہی ہے جو میری فطرت سلیمہ کے ذریعہ میری ہدایت کرے گا۔

ارکان ثلاثۂ تعمیر عالم

پس دنیا کا نظام فطرت تین چیزوں سے مکمل ہوتا ہے: مادہ، قوت اور دونوں سے الاتر ایک ذی شعور طاقت، جو ان دونوں میں ربط و اتحاد پیدا کرتی ہے، اور وہ فطرتِ صالحہ وسلیمہ ہے جو اصلاً خود انسان کے اندر موجود ہے۔

خدا تعالیٰ نے نظامِ عالم کی ان تینوں کڑیوں کا ذکر بہ ترتیب ایک سورہ میں کیا ہے۔

والشمس وضحٰھا — سورج اور اس کی حرارت و توانائی

والقمر اذا تلٰھا والضحٰھا — چاند جو اس کے بعد ضیا گستر ہوتا ہے۔

کا ضمیر جس طرح ملامت کرتا ہے، در اصل اسی فطری احتساب کا اثر ہے۔

لا اقسم بالنفس اللوامۃ ﴿۷۵:۲﴾

اس پاک روح کی قسم جو گناہ کرنے کے بعد انسان کو بہت ملامت کرتی ہے۔

اصول ارتقاء کے بموجب ترقی کا یہ وہ نقطہ ہے، جہاں سے (قوت نباتات میں) حرکت کرکے جمادات، نباتات کے قالب میں آتے ہیں۔ اس کے بعد اس قوت کے حیوانی مظاہر کی منزل شروع ہوتی ہے۔ حیوانات کی طرح انسان بھی اپنے بچوں کی تربیت و رہنمائی میں اس قوت کو صرف کرتا ہے اور جو آگ اس کے اندر بھڑک رہی ہے، اسی کو ان کے اندر بھڑکانا چاہتا ہے۔

یا بنی اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علیٰ ما اصابک ان ذالک من عزم الامور ﴿لقمان:۱۶﴾

اے بیٹے! صلوٰۃ الٰہی کو قائم کر! نیکی کا لوگوں کو حکم دے! برائی سے روک! اور اس فرض احتساب کے ادا کرنے میں جو جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، ان پر صبر کر! یہ بڑے ہی پختہ ارادے اور اعلیٰ درجہ کا کام ہے۔

حیوانات کی انتہائی منزل کی سرحد سے انسانیت کی سرحد شروع ہوتی ہے دفعتاً ایک انسان کامل منصۂ عالم پر جلوہ گر ہوتا ہے، اور خدا کے نور کو اپنے اندر جذب کرکے دنیا کے سامنے نمودار کرتا ہے۔

والنہی عن المنکر کی عظیم الشان دیواریں قائم ہوتی ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اسے امر بالمعروف ونہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا ... اور برائی سے روکنا کہا ہے، اور فطرت کا علم صحیح بتلاتا ہے کہ کائنات کا نظامِ عدل وتکوین در اصل انہی تینوں رکنوں پر قائم ہے

مدارجِ احتساب

لیکن تمام نظامِ عالم ترقی پذیر ہے۔ اس لئے اس کی ہر کڑی ترقی کی طرف آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ مادۂ عالم آغازِ خلقت سے اب تک سینکڑوں دورے بدل چکا ہے۔ قوی اجسامانی نے بچپن سے بڑھاپے تک ترقی وانحطاط کی سینکڑوں منزلیں طے کی ہیں۔ پس اس ارتقاء ونشو ونما کے اصول پر قوتوں کے ساتھ ساتھ قوتِ احتساب بھی ترقی کرتی رہتی ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے انسان کے اندر سے ہمیشہ برائی کی صدا اٹھاتی ہے۔

ان النفس لامارۃ بالسوء (یوسف: ۵۲)	نفس برائی کے لئے بہت ہی بڑا حکم دینے والا ہے۔

اس لئے اس کی قوتِ احتساب سب سے پہلے اسی کے اندر عمل کرتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد ہر شخص کو جو ندامت ہوتی ہے، اور اس پر اس

ارتقاء روحانی:۔

ترقی کے اس نقطے پر پہنچ کر ارتقاء کی وہ چاروں منزلیں طے ہو جاتی ہیں جن کے ہفت خوان کے طے کرنے کا سہرا (EVOLUTION) کے سر پر باندھا گیا ہے۔

لیکن ارتقاءِ مادی اور امر بالمعروف کے مدارج میں ایک دقیق فرق ہے قائلینِ مذہب نشو و ارتقاء کے مذہب میں جب جمادات کی ترقی اپنے آخری درجہ تک پہنچ جاتی ہے اور انسان کی نسل زمین پر پھیل جاتی ہے، تو مادی قوانین ارتقاء یک قلم معطل ہو جاتے ہیں، اور اس کے بعد کوئی عمل جدید نہیں کرتے۔ لیکن امر بالمعروف والنہی عن المنکر اپنے آخری درجہ پر پہنچ کر ایک جدید قوت پیدا کرتی ہے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں صلوٰۃ الٰہی، کہتے ہیں "صلوٰۃ" کے اندر وہ تمام اعمال کاملہ وحقہ و تعاونہ داخل ہیں جن کو عبودیت الٰہی کے ارتقاء و علو کے ساتھ دنیا میں ایک انسان کامل انجام دیتا ہے، اور اس طرح ہر عام "انسانی فعل" ایک مزید درجۂ حرارت و ترقی و نشو و نما پاکر "عبادات" بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی قوت ہے جو اپنی خاموش زبان سے دنیا کی ہدایت کرتی ہے۔

انّ اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون۔ (نحل: ۹۰)

خدا عدل، احسان، اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم کرتا ہے، اور ہر قسم کی برائیوں، اور ہر قسم کے ظلم سے روکتا ہے خدا یہ نصیحت اس لئے کرتا ہے کہ شاید تم لوگ عبرت پکڑو۔

چاند دنیا کو وہی روشنی دکھاتا ہے، جس کو اس نے آفتاب سے حاصل کیا تھا اس لئے یہ انسان بھی وہی فرض ادا کرتا ہے، جس پر مامور کرکے خدا نے اس کو بھیجا تھا۔

یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث (اعراف ۱۵۷)

ان کو نیکی کا حکم کرتا ہے۔ برائیوں سے روکتا ہے مفید اور صالح چیزوں کو حلال، اور بری چیزوں حرام کرتا ہے۔

اب انہی اوصاف و مناقب کے ساتھ متصف ہوکر اس کی پاک نسل دنیا میں پھیلتی ہے۔ اور انسانیتِ کاملہ کا ظہور عام ہو جاتا ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (آل عمران ۱۱۰)

تم لوگ دنیا کی بہترین امت ہو جس کو خدا نے دنیا کی ہدایت کے لئے نمایاں کیا۔ کیوں کہ نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو۔

وتقطعون السبیل و تاتون فی نادیکم المنکر (عنکبوت: ۲۸) — مرتکب ہو، دن دہاڑے ڈاکہ مارتے ہو، اور اپنی صحبتوں میں علانیہ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہو۔

اس لئے اب زندگی کے مدارج نباتاتی و حیوانی دونوں فنا ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کاملہ کا ظہور انہی کی تدریجی ترقی کا نتیجہ تھا۔ پس جب اس کی ابتدا کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں تو انسانیت کاملہ کا درجہ بھی (جو آخری کڑی کا حکم رکھتا ہے)، فنا ہو جاتا ہے، بلکہ فنا کر دیا جاتا ہے۔

ان الذین یکفرون بایٰت اللّٰہ و یقتلون النبیّٖن بغیر حق۔ (۳: ۲۰) — وہ لوگ جو آیاتِ الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں، اور ان کا سب سے بڑا انکار یہ ہے کہ ان کے حاملین اور داعیوں کو قتل کرتے ہیں

اب انہی لوگوں کے ہاتھوں اس انسان کامل کی وہ نسل بھی مفقود ہو جاتی ہے جو اس فرض احتساب کو ادا کرتی تھی۔

و یقتلون الذین یامرون بالقسط من الناس۔ (۳: ۲۰) — اور یہ بدبخت ان پاک انسانوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں، جو عدل اور صراطِ مستقیم کی طرف انسانوں کو بلاتے اور امرِ حق کا حکم دیتے ہیں۔

لیکن ترقی و تنزل کے یہ مدارج ایک ہی اصول کے تابع ہیں جس طرح نسل حق تدریجی ترقی کے بعد پیدا ہوتی تھی، اسی طرح فنا بھی ہوتی ہے۔ امر بالمعروف

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر۔ — نماز ہر قسم کی برائیوں سے روکتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم یہی اعلیٰ ترین عملی قوت شرک و بت پرستی سے روکتی تھی، اس لئے ان لوگوں نے کہا۔

أصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا (۱۲: ۸۸) — کیا تمہاری عبادت تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ اس راہ کو چھوڑ دیں جس پر ہمارے باپ دادا کا عمل تھا اور جس چیز کی وہ پوجا کرتے تھے؟

قانون تنزل:

لیکن قوتِ احتساب نے جس طرح ترقی کی تھی، اسی طرح انحطاط کے مدارج بھی شروع ہوتے ہیں۔ جو انسان کہ اپنے بچوں کی قوتِ احتساب کو ترقی دے سکتا تھا۔ ایک وقت آتا ہے کہ خود اپنی قوت محتسبہ ہی کو فنا کر دیتا ہے، اور اس کے تمام حواس ظاہری و باطنی خارجی ضلالت کے اثرات سے معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر شخص علانیہ منکرات و معاصی کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اپنی فطرتِ صالحہ و سلیمہ کو یک قلم مسخ کر دیتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا تھا۔

ائنکم لتاتون الرجال — تم لوگ فعل خلاف وضع فطری کے

بھی شروع ہو جاتی ہے، کہ پرستاران باطل حق کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور سچائی اور نیکی کو دنیا سے بالکل معدوم و فنا کر دینا چاہتے ہیں۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (توبہ: ۶۸)

منافق مرد اور منافق عورتیں جو امات باطل اور مخالفت حق میں ایک دوسرے کے ساتھی اور سازشی ہیں، برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کو نیکی سے روکتے بھی ہیں۔

انحطاط کا یہی درجہ ہے جہاں پہنچ کر اس نسل کا خاتمہ ہو جاتا ہے، آمرین بالمعروف علانیہ قتل کئے جاتے ہیں، طرح طرح کی تکلیفیں اور قسم قسم کی دنیوی سزاؤں سے ان کی جماعت کو ہلاک کیا جاتا ہے، اور اس طرح وہ روح صالح فنا کر دی جاتی ہے جو دنیا کو ایک عام دعوت دیتی تھی، اور وہی انتظام انسانیت کبریٰ کی آخری منزل تھی۔

لوازم و اعراض

اس تفصیل سے تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ امر بالمعروف والنہی عن المنکر ایک روح عامہ کا نام ہے جو تمام کائنات ہستی پر حکومت کرتی ہے، لیکن روح کے مظاہر مختلف ہوتے ہیں۔ حیوان اور انسان دونوں میں روح ہے

اور احتساب انسانی کی ترقی کے کئی درجے تھے۔ اسی طرح اس کا تنزل بھی تین درجوں میں منقسم ہے، ابتدا میں یہ گمراہ نسل اگرچہ خود نیکی پر عمل نہیں کرتی، تاہم دوسروں کو نیکی کرنے کا حکم رسماً و عادتاً ضرور دیتی رہتی ہے۔ یہ تنزل کا پہلا درجہ ہے۔

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم (بقرہ: ۴۱)

دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو لیکن خود اپنے نفسوں کو بھول گئے ہو جو سب سے زیادہ اس حکم کے مستحق ہیں؟

لیکن رفتہ رفتہ یہ حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ خود یہی نسل دوسروں کو برائی کا حکم بھی دینے لگتی ہے اور اس طرح احتساب حق کا آخری نقشِ پا بھی مٹ جاتا ہے۔ تاہم یہ دوسرا درجہ ہے۔

الذین یبخلون ویامرون الناس بالبخل۔ (نساء: ۴۱)

وہ بدبخت جو خود بھی بخل کرتے ہیں، اور دوسروں کو بھی بخل کے لئے حکم کرتے ہیں، اور اس طرح اللہ کی دی ہوئی طاقت کو

اللہ کی راہ میں نہ تو خرچ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔

اس کے آگے ایک درجہ اور آتا ہے۔ دوسرے درجہ میں گر کر یہ نسل برائی کا حکم دیتی تھی، لیکن ابھی تک نیک کاموں میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتی تھی۔ اب تیسرا درجہ الہٰی قوت کے فقدان اور شیطان کے تسلط کے اعلان کا آتا ہے، اور صرف یہی نہیں ہوتا کہ برائی کی جائے اور برائی کی تعلیم دی جائے، بلکہ ان دونوں مدارج ابلیسیت کے ساتھ ساتھ یہ نتہائے شیطنت

اگر یہ روح ترقی کرکے بڑے بڑے مظاہر ڈھونڈھتی ہے۔ کبھی جزو نبوت بن جاتی ہے۔ یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث۔ یہ آیت کریمہ اوپر گذر چکی ہے۔

کبھی ایک اُمت مسلمہ و عادلہ کی خلافت کے اندر سے نمایاں ہوتی ہے۔

الذین ان مکنٰھم	وہ خدا کے مومن بندے کہ اگر ہم ان
فی الارض اقاموا الصلوٰۃ	کی خلافت کو دنیا میں قائم کردیں تو اُن
واٰتوا الزکوٰۃ وامروا	کا یہ کام ہوگا کہ صلوٰۃ الٰہی کو قائم کریں گے،
بالمعروف ونھوا عن	اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں گے۔
المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور	نیکی کا حکم دیں گے، اور برائی سے روکیں گے۔
(حج: ۴۲)	اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

کبھی نیک بندوں کے اعمال کے اندر سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

اقم الصلوٰۃ: ان	صلوٰۃ الٰہی کو قائم کر۔ بلاشبہ وہ تمام
الصلوٰۃ تنھی عن الفحشآء	برائیوں سے روکتی ہے، اور خدا کے ذکر
والمنکر، ولذکر اللّٰہ اکبر	کا اثر تو اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔
(عنکبوت: ۴۴)	

کبھی ایک مستعد گروہ کے اندر سے جلوہ گر ہوتی ہے۔

امۃ قائمۃ یتلون	وہ حق پرست جماعت جس کے افراد

لیکن دونوں کے آثار و نتائج مختلف ہوتے ہیں، روح حیوانی میں وہ نور نورنہیں ہے جس سے انسان کا دماغ روشن ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف کی روح اگرچہ فطرتاً تمام عالم میں ساری ہے، لیکن ترقی و تنزل کے لحاظ سے اس کے مدارج مختلف ہیں۔ اس روح کا سب سے اعلیٰ مظہر خود خدائے ذوالجلال ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتائی ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر و البغی (النحل: ۹۰)	خدا عدل، احسان، اقربا کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور ہر قسم کی برائیوں اور ہر قسم کے غصب حقوق سے روکتا ہے۔

لیکن خدا کی روشنی کو وہی لوگ دیکھتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے۔

انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء (فاطر: ۲۸)	خدا کے بندوں میں صرف وہی لوگ خدا کا خوف اپنے اندر رکھتے ہیں جو ارباب علم و بصیرت ہیں۔

اس لئے یہ روح بھی سب سے پہلے انہی کے قلب میں امر بالمعروف والنہی عن المنکر کا احساس پیدا کرتی ہے۔

واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ (نازعات: ۴۰)	وہ شخص جو اپنے خدا سے ڈرا اور جس نے نفس کو ہوا پرستی سے روکا۔

من قبلکم اولو ا بقیۃ ینھون عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منھم و اتبع الذین ظلموا ما اترفوا فیہ و کانوا مجرمین۔

(ہود: ۱۱۶)

لیے داعیان حق کیوں نہ ہوئے جو ظلم و فساد سے روکتے؟ بلا شبہ ہوئے البتہ ان کی تعداد تھوڑی تھی اور یہی ارباب اصلاح و معروف تھے جن کو نیدگا فلالت نے نقصان پہنچانا چاہا۔ مگر ہم نے بچالیا، اور ارباب ظلم و فساد اپنے فسق و فجور ہی میں مبتلا رہے۔ بلا شبہ یہ مجرموں میں سے تھے کہ انہوں نے قانون الہی سے بغاوت کی!

لیکن عام لوگوں پر اس کی ترقی و تنزل دونوں کے مدارج کا اثر یکساں پڑتا ہے۔ جس طرح دھندلی روشنی کو ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح آفتاب کے قرص پر بھی ہر نگاہ نہیں ٹھہر سکتی۔ جب علماء کی قوت احتساب براہ راست نہیں کر سکتی۔ اس وقت خدا اپنے ایک کامل بندے کو چن لیتا ہے جو نور الہی کو جذب کر سکتا ہے۔ جس کی بصیرت میں آفتاب الہی کے دیکھنے اور اکتساب نورانیت کی طاقت کامل موجود ہوتی ہے۔ اور وہ دوسروں کے اندر بھی اس روشنی کی کرنوں کو نافذانہ پہنچا سکتا ہے۔ یہی درجہ مقام اعظم نبوت ہے، اور اسی لئے دنیا میں ہر شخص کو چاہیئے کہ بغیر کسی بحث و مباحثہ کے احکام کو تسلیم کرلے، کیونکہ ہر شخص نجات خود اس نور کا کسب نہیں کر سکتا۔ وہ ایک قوت قاہرہ منورہ کا محتاج ہے۔ یہ قوت منورہ مقام نبوت کی فعالیت ہے، اور اسی بنا پر خدا نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے۔

ایٰتِ اللّٰہِ اٰناءَ الّیل وھم یسجدون۔ یومنون باللّٰہ والیوم الآخر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویسارعون فی الخیرات واولٰئک من الصالحین۔

(آل عمران: ۱۰۹)

کا یہ حال ہے کہ راتوں کو اٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کے سر اس کے آگے جھکے ہوتے ہیں، اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں، اور نیک کاموں کے لئے سرگرم رہتے ہیں، سو یہی لوگ ہیں کہ ان کا شمار "صالحین" میں ہے۔

لیکن ہر حالت میں وہ ایک روشنی ہے جو دنیا ہی کو دی جاتی ہے، اس لئے سب سے پہلے وہ آمرین بالمعروف کو ٹھوکر سے بچاتی ہے۔ وہ دنیا کے نشیب و فراز اور سنگ وخاشاک سے بچ کر صحیح و سالم نکل جاتے ہیں۔

فلما نسوا ما ذکروا به انجینا الذین ینھون عن السوء

(اعراف: ۱۶۵)

اور جب ان لوگوں نے اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت کو بھلا دیا، جو آمرین بالمعروف کے ذریعہ ان کو یاد دلائی ہوتی تھی۔ تو ہم نے ان کی برائیوں سے دامان حق کو بچا لیا

تاکہ بدکاروں کا ظلم انھیں نقصان نہ پہنچا سکے۔

اگر یہ روشنی نہ ہوتی تو تمام دنیا ایک ظلمت کدۂ ہلاکت بن جاتی اور عقل کی آنکھ کچھ بھی نہ دیکھ سکتی:۔

فلولا کان من القرون

جو قومیں تم سے پہلے گذر چکی ہیں ان میں سے

اعمال نبوت بحیثیت محتسب

احتساب

احتساب ایک سنہری زنجیر ہے، جس میں تمدن، اخلاق، مذہب، اور معاشرت کے تمام جزئیات جکڑے ہوتے ہیں۔ اگر اس کی بندشیں ڈھیلی پڑ جائیں، تو دفعتاً نظام عالم کی ایک کڑی درہم برہم ہو جائے اسی غرض سے دنیا نے احتساب کو مختلف صورتوں میں قائم رکھا۔ خاندانوں اور کنبوں نے مختلف رسم و رواج اختیار کئے جن کی خلاف ورزی موجب ملامت بلکہ بعض اوقات قومی جرم خیال کی جاتی ہے۔ سلطنتوں نے قوانین بنائے جو انسان کو ایک خاص نظام کے ماتحت ہر قسم کی مادی، اخلاق، اور مذہبی ترقی کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ حکماء نے فلسفہ ایجاد کیا، جو اخلاقی قوانین، کی پیروی پر جمعیت بشری کو مجبور کرتا ہے۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ — رسول تم کو جن چیزوں کا حکم دے، اس پر
وما نہاکم عنہ فانتھوا — عمل کرو، اور جس چیز سے روکے اس سے
(حشر: ۷) — رک جاؤ!

پس یہ حکم جبری نہیں ہے، بلکہ عین فطری ہے۔ اور فطرت کے سامنے انسان کو گردن جھکا دینی چاہیئے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شخص کا فرض ہے کہ اس روشنی کو دنیا میں پھیلاتے اور اگر دنیا اس کو قبول نہ کرے تو مایوس نہ ہو کیوں کہ نیکی کا حکم کبھی بے اثر نہیں رہ سکتا، اور دنیا کو بہر حال برائی سے روک ہی دیتا ہے۔

لولا ینھاھم الربانیون — اگر علماء واحبار حق یہودیوں کو بری باتوں
والاحبار عن قولھم — کے کہنے اور حرام کھانے سے نہ روکتے، تو وہ
الاثم واکلھم السحت — اس سے بھی زیادہ برائیوں اور بدکاریوں
لبئس ما کانوا یصنعون — میں ڈوبتے جتنی (باوجود تجدید تجاحق اور
(مائدہ: ۶۸) — آمرین بالمعروف کی تعلیمات کے) اب میں نظر آرہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم رسول اللہ کی تقلید کرو، کیوں کہ ایک شخص کی تقلید کرنے سے دوسرے اشخاص کی تقلید کی نفی ہو جاتی۔ بلکہ یہ فرمایا کہ تمہاری صرف اسی ذات پاک میں محدود ہے، کیوں کہ تمہیں اعمال صالحہ کا یہ خزانہ دوسری جگہ نہیں مل سکتا۔ اس طرز بیان سے نہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع لازم کر دیا گیا۔ بلکہ ساتھ ہی تمام بڑے بڑے انسانوں کے اتباع کی نفی بھی کر دی اس لئے صرف ایک ہی آفتاب ہے جس کی روشنی ظلمت زار دنیا کی ہر اندھیری راہ اور ہر تیرہ و تاریک راستے میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے ؎

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم ۔ نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

اسی آفتاب کی روشنی سے اور سیارے بھی نور حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا اتباع بھی ہم پر واجب ہو جاتا ہے۔

خیر القرون قرنی	بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، اس کے
ثم الذین یلونہم	بعد ان لوگوں کا دور جو اس کے بعد
ثم الذین یلونہم	آئیں گے، پھر وہ لوگ جو اس کے بعد
اصحابی کالنجوم	اس اسوۂ حسنہ کی تقلید کریں گے

میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی اس خصوصیت کا بار بار ذکر کیا ہے۔

وھو الرسول النبی ۔ اور یہ وہی پیغمبر اُمّی ہے، جس کی

اگر یورپ کو اپنی تہذیب پر فخر ہے کہ وہ انسان کی ہر فرو گذاشت پر سختی کے ساتھ گرفت کرتی ہے، اگر رومن لا کو اپنے اوپر ناز ہے کہ وہ قوائے متضادہ کو اپنے مرکز سے ہٹنے نہیں دیتا، اگر یونان کو اپنے فلسفۂ اخلاق پر گھمنڈ ہے کہ وہ اخلاقی قوا کی تربیت کرتا ہے، تو ہم کو ان کے بڑے بول سے مرعوب نہیں ہونا چاہیئے۔ ہم رسم و رواج کے غلام نہیں ہیں کہ یورپ کے قوانین معاشرت پر فریفتہ ہو جائیں، ہم قانونی سختیوں کے برداشت کرنے کے خوگر نہیں ہیں کہ اپنے ہاتھ کو ہر ہتھکڑی کے حوالے کر دیں۔ قیاسیات عقلی ہماری غذائے روحانی نہیں ہے۔ کہ یونانیوں کے طلسم میں پھنس جائیں، بلکہ ہمارے رگ پٹھے ایک مذہب کے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں، ہمارے گوشت و خون پر چمڑے کی جگہ مذہب کا غلاف چڑھا ہوا ہے، ہمارے قلب کو ایک غیر متزلزل مذہبی احساس حرکت دے رہا ہے۔ پس ہم کو ہر دلفریب رسم و رواج پر مرعوب کرنے والے قانون، اور ہر متحیر کر دینے والے فلسفہ کو چھوڑ کر اپنی باگ صرف اسلام ہی کے ہاتھ میں دے دینا چاہیئے اور اس پر فخر کرنا چاہیئے۔ کہ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

مذہب کی قوت احتساب ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اتباع فرض کر کے ہم کو تمام دنیا کی مادی و اخلاقی غلامی سے آزاد کر دیا ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں، پیروی و اتباع کے لئے بہترین نمونہ رکھا گیا ہے

کے قبیلہ اور قوم تک منتہی ہوجاتی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض احتساب کو اسی ترتیب کے ساتھ ادا فرمایا ہے۔

اصلاح نفس

آنحضرت کی ذات پاک جامع فضائل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام زلات کو معاف کر دیا تھا۔ بایں ہمہ آپ اس کثرت سے نماز پڑھتے تھے کہ پاؤں پھول کر پھٹ پھٹ جاتے تھے۔ صحابہ نے اس ریاضت شاقہ کو دیکھ کر عرض کیا "یا رسول اللہ! خدا نے تو آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا ہے۔ پھر آپ کیوں اس قدر مصروف عبادت رہتے ہیں؟" آپ نے فرمایا:

افلا اکون عبداً شکوراً[1] — کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ ہونے کی کوشش نہ کروں؟

چنانچہ جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جو قلب کو خدا کی طرف سے پھیر دے سکتے تھے، یا نفس میں غرور و تکبر پیدا کر سکتے تھے، تو آپ نہایت سختی کے ساتھ ان کا انکار فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک

---

[1] بخاری مطبوعہ نولکشور ص ۹۲ جز ۳

الامی المکتوب فی التوراۃ والانجیل:- یامرہم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لہم الطیبات ویحرم علیہم الخبائث (۷: ۱۵۷)

نبوت تورات وانجیل میں لکھی ہوئی ہے۔ وہ نیکی کے کام کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے پاک و مفید چیزوں کو حرام کرتا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ وتؤمنون باللہ۔

تم لوگ بہترین امت ہو جس کو خدا نے دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لئے نمایاں کیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان لاتے ہو۔

لیکن ان آیتوں کی عملی تفسیر ہم کو صرف احادیث کی کتابوں میں ڈھونڈنا چاہیئے جن کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے مواقع احتساب کے ایک ایک جزئیات کا پتہ لگ سکتا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہدایت وارشاد کے لئے جو آفتاب و سیارے پیدا کئے تھے، وہ ہمیشہ ضیا گستر رہتے تھے۔

اسوۂ نبوی

احتساب کی ترتیب اصلاحِ نفس سے شروع ہو کر بالترتیب محتسب

احتساب قبیلہ وخاندان

خیرات گھر ہی سے شروع ہوتی ہے، اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو حکم دیا تھا۔ وانذر عشیرتک الاقربین۔ اپنے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے آگے حق کو پیش کرو اور عذابِ الٰہی سے ڈراؤ۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے اپنے تمام قبیلہ کو جمع کرکے ایک پیغمبرانہ لہجہ میں اس حکم الٰہی کو سنایا۔

"یا معشر قریش! یا معشر بنی عبد مناف! یا معشر بنی قصیٰ! یا معشر بنی عبد المطلب! اے فاطمہ محمد (صلعم) کی بیٹی، تم سب اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، کیوں کہ میں تمہیں قیامت کے دن کچھ بھی نفع و نقصان نہ پہنچا سکوں گا! اے فاطمہ! تجھ کو مجھ سے صرف جسمانی تعلق ہے، اور میں رشتے کی بیل کو صرف دنیا ہی میں سرسبز و شاداب رکھ سکوں گا[۱]"

یہ ایک عام احتساب تھا، لیکن مخصوص مواقع پر بھی آپ ازواجِ مطہرات اور اہل و عیال کو نیکی کی ترغیب دیتے، اور برائی سے روکتے رہتے تھے۔ ام سلمہ

---

[۱] ترمذی صفحہ ۵۳۶ کتاب التفسیر۔

پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویریں بنی تھیں، آپ کی نظر پڑی تو فرمایا۔

اصطلی عنا قرامك ہمارے سامنے سے اپنا پردہ ہٹالو کیوں کہ
فانہ لاتنزال تصاویرہ اس کی تصویریں ہمیشہ میری نماز میں خلل انداز
تعرض۔ فی صلاتی ؎ ہوتی رہتی ہیں۔

ایک صحابی نے بطور تحفہ کے آپ کو حریر کا ایک جبہ دیا۔ آپ نے اس کو پہن کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد نہایت ناگواری سے اتار کر پھینک دیا اور فرمایا۔

لا ینبغی ھذا للمتقین ؎ یہ پرہیزگاروں کے قابل نہیں ہے

غرور و کبر کا سرچشمہ مدح و تعریف ہے، امراء و سلاطین کو اسی مرض نے دنیا کی تمام چیزوں سے بالاتر بنادیا ہے، آنحضرت گرچہ خیر البشر تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص آپ کو انبیائے سابقین پر ترجیح دیتا تھا۔ تو آپ اس کو منع فرماتے تھے۔ ایک صحابی اور ایک یہودی میں جھگڑا ہوگیا، صحابی نے غصہ میں قسم کھائی اور کہا "اسی خدا کی قسم جس نے محمد (صلعم) کو تمام دنیا سے افضل بنایا ہے" یہودی نے بھی قسم کھائی اور کہا "اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ کو تمام دنیا پر ترجیح دی ہے۔ صحابی نے اس پر غصہ میں آکر یہودی کے منہ پر طمانچہ دے مارا، اس نے آنحضرت سے شکایت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ "مجھے موسیٰ پر ترجیح نہ دو۔" ؎

؎ بخاری جزء ۱ ص ۔ ۵۰ ؎ بخاری جزء ۱ ص ۔ ۸۰ ؎ بخاری جزء ۸ ۔ ص ۔ ۱۰۸

ہے احتساب قومی کے تحت میں داخل ہیں، لیکن آپ نے کلی طور پر دو موقعوں پر نہایت بلیغ تشبیہ کے ساتھ اپنی اس خصوصیت کا اظہار تمام قوم کے سامنے فرمایا۔

ایک موقعہ پر فرمایا:۔

"میری اور میری شریعت کی مثال بعینہٖ اس شخص کی سی ہے، جس نے ایک قوم کے پاس آکر یہ وحشت انگیز خبر سنائی کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر تمہاری طرف آتے ہوتے دیکھا ہے، میں ایک نذیر عریاں ہوں (عرب میں کسی اہم انقلابی واقعہ کی خبر ننگے ہوکر دیتے تھے) پس تم کو ہوشیار ہو جانا چاہئیے۔ چنانچہ ایک گروہ نے اس کا کہنا مانا اور وہ رات بچ کے نکل گیا اور دوسرے ایک گروہ نے اس کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر نے دھاوا مارا اور اس کا استیصال کر دیا۔"[1]

دوسرے موقعہ پر آپ نے فرمایا:۔

"میری اور تمام لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ بھڑکائی جب آگ کی روشنی چاروں طرف پھیلی، تو پروانے اس پر ٹوٹ کر گرنے لگے اس نے پروانوں کو آگ میں جانے سے روکنا چاہا، لیکن وہ سب اس کے قابو میں نہ آسکے اور آگ میں گھس گئے۔

اسی طرح تم لوگوں کو کمر سے پکڑ کر کھینچتا ہوں تاکہ آگ میں داخل ہونے نہ پاؤ لیکن لوگ اس میں گھسے جاتے ہیں۔"[2]

---

[1] بخاری جز اول۔ ص۔ ۵۰

[2] بخاری جز ۸۔ ص۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲

سے روایت ہے کہ آپ ایک رات کو اٹھے اور فرمایا "سبحان اللہ! آسمان سے فتنہ و فساد کی بارش ہو رہی ہے اور برکات و فضائل کے خزانے کھل گئے ہیں۔ حجرے میں سونے والیوں کو (ازواج مطہرات) جگا دو کیوں کہ دنیا کی بہت سی کپڑے پہننے والی عورتیں آخرت میں برہنہ نظر آئیں گی[1]۔"

آپ نے تنزہ نفس اور استغنا و قناعت کی وجہ سے باوجود فقر و فاقہ کے اپنے اوپر اور اپنے تمام خاندان کے اوپر صدقہ کو حرام کر دیا تھا۔

امام حسین علیہ السلام نے ایک مرتبہ بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ آپ کی نگاہ پڑی تو فوراً لڑکا "کخ کخ" کیا تمہیں خبر نہیں کہ ہمارا خاندان نہیں کھاتا۔"[2]

آپ ایک مرتبہ شب کو حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہ پاس آئے اور فرمایا "تم لوگ اٹھ کر تہجد نہیں پڑھتے؟" حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا "ہماری نیند اور بیداری تو خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ جگائے گا تو جاگیں گے۔" آنحضرت خاموش ہو گئے مگر اپنی ران پر افسوس کے ساتھ ہاتھ مارا اور یہ آیت پڑھی کان الانسان اکثر شیئٍ جدلا - آدمی بڑا ہی جھگڑالو ہے۔

احتساب قوم

اگرچہ وہ تمام جزوی مواقع جہاں آنحضرت نے احتساب کا فرض ادا کیا

---

[1] بخاری جز ۲۰ - ص ۳۰۰   [2] بخاری جز ۲ - ص ۱۲۸۰

لیغفر الظلال الا حسم قوموں کو اسی قسم کے لا یعنی مسائل
قبلکم ؎ نے برباد کر دیا۔

اسلام نے اگرچہ عرب جاہلیت کے تمام توہم آمیز عقائد کو مٹا دیا تھا، تاہم بعض باتیں باقی رہ گئی تھیں، اور کبھی کبھی ان کا ظہور ہو جاتا تھا۔ عرب کا خیال تھا۔ کہ جب کوئی بڑا شخص مرتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم نے انتقال کیا تو اتفاق سے اسی دن سورج میں گہن بھی لگ گیا۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ حضرت ابراہیم ہی کی موت کا اثر ہے لیکن آپ نے فوراً اس خیال سے لوگوں کو روکا، اور فرمایا ؎ "چاند اور سورج کو کسی کے مرنے یا جینے سے گہن نہیں لگتا۔"

عبادات

عبادات چوں کہ روز کی چیز تھی جس میں سہو و غفلت اور بے عنوانی کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس لئے آنحضرت کو اس کے متعلق احتساب کی اکثر ضرورت پیش آئی تھی۔ اسلام نے ادائے نماز کے لئے جماعت کو واجب قرار دیا تھا۔ لیکن اکثر لوگ اس میں غفلت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت نے

؎ بخاری جزء ۶ جلد ۲ ص ۱۴۴۔ ؎ صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد ۲ و ترجمہ ص ۲۔

عقائد

آنحضرتؐ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد تصحیح عقائد میں بدترین چیز شرک فی اللہ تھی، اور آنحضرتؐ نے صرف شرک ہی کے مٹانے کے لئے جہاد کیا جو تصوّف کی آخری منزل ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے عقائد ہیں جو عام دسترس سے باہر ہیں۔ اگر عام لوگوں کو اُن میں غور و فکر کرنے کا موقع دیا جائے، تو مذہبی عقائد میں بہت سے مفاسد پیدا ہو جاتیں، اور اسلامی عقائد کی رات کی فنا ہو جائے جو اسلام کا سب سے بڑا زیور ہے۔ اسی غرض سے آنحضرتؐ نے مسلمان کی یہ خصوصیت قرار دی تھی کہ وہ غیر ضروری چیزوں میں وقت ضائع نہیں کرتے۔ چنانچہ عہد نبوت میں جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ صحابہ کو زجر و توبیخ کی ہے۔

ایک مرتبہ صحابہ مسئلہ قضاء و قدر کے متعلق مباحثہ کر رہے تھے، جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے دو عظیم و حریف مقابل فرقے پیدا کر دیئے۔ آنحضرتؐ نے دیکھا تو چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا، اور فرمایا۔

أبهذا خلقتم تعنی بہذا	کیا تم لوگ اسی لئے پیدا کئے گئے ہو؟
القرآن بعضه ببعض	تم لوگ قرآن کو گڈمڈ کر رہے ہو گذشتہ

عبادات اور مقدمات عبادات کے متعلق آپ نہایت معمولی اور جزئی باتوں پر بھی گرفت فرماتے تھے۔ ایک بار سفر میں تھے، نماز عصر کا وقت آگیا صحابہ نے پاؤں کا مسح کیا، آپ نے دیکھا تو دور سے چلا کر آواز دی۔

ویل للاعقاب من النار[1] ایڑیوں کے لئے آگ کا عذاب ہے۔

ابتدائے اسلام میں نماز کے قیام داد کی حالت بالکل ابتدائی تھی۔ اور تمام جزئیات و فروعات ابھی واضح نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح کا تدریجی ارتقا ہر مذہب کی ہر تعلیم میں ہوتا ہے۔ موجودہ حالت ایک مدت کے تغیرات کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ابتدا میں اکثر لوگ مسجد کے اندر تھوک دیتے تھے ایک مرتبہ آپ نے مسجد میں تھوک کا دھبہ دیکھا، خود اٹھے اور اپنے دست مبارک سے اس کو مٹا دیا، پھر فرمایا "نماز میں ہر شخص خدا سے سرگوشی کرتا ہے۔ اس لئے کسی شخص کو قبلہ کی طرح تھوکنا نہیں چاہئے، البتہ دائیں بائیں، یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوک سکتا ہے"[2] یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت مسجد کا فرش پختہ نہ تھا۔ صحن مسجد اور عام سطح زمین میں سرا حد و دعمارت کے اور کوئی امتیاز قائم نہ تھا۔ ریتلی زمین تھی اور وہ ہر طرح کی رطوبت جذب کر لیتی تھی۔ لیکن اب مسجدوں کا تمام حصہ پختہ ہوتا ہے۔ پس وہاں تھوکنا مسجد کی صفائی اور نمازیوں کے حقوق نشست و مقام پر حملہ کرتا ہے۔

---

[1] بخاری جز ۱ - ص - ۲۷ - [2] بخاری جز ۱ - ص - ۸۷ -

جماعت میں چند اشخاص کو ڈھونڈا تو نہیں پایا۔ نہایت برہم ہوتے اور فرمایا۔ جی میں آتا ہے کہ ایک شخص کو امام بناکر خود ان لوگوں کے پاس چلا جاؤں اور لکڑیوں کا ڈھیر لگاکر ان کو آگ میں پھونک[1] دوں۔

بعض لوگ جب امامت کرتے تھے تو نماز میں طول دیتے تھے۔ جس سے کاروباری اور ضعیف لوگ گھبرا جاتے تھے۔ ایک شخص نے اسی بنا پر امام کی شکایت کی۔ آپ کو معمول سے زیادہ غصہ آگیا، اور فرمایا۔ تم لوگوں کو مذہب سے متنفر کررہے ہو۔ امام کو نماز میں تخفیف کرنی چاہیئے۔ کیوں کہ ان میں مریض ضعیف و کاروباری ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں[2]

نماز کا اصلی مقصد خشوع و خضوع ہے، لیکن جب کسی کے طرز عمل سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت اس کو تنبیہ فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت عجلت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز پڑھ چکا تو آپ نے فرمایا نماز کو پھر دوہراؤ"، تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ اس نے تین بار نماز دوہرائی۔ اور آپ نے تینوں بار ٹوکا، آخر میں اس نے کہا "اب میں اس سے بہتر نماز نہیں پڑھ سکتا"۔ آپ نے تکبیر، قرأت، رکوع، سجود، قیام و قعود کے وہ طریقے بتائے جن سے اطمینان، سکون، وقار، اور اعتدال کا اظہار ہوتا تھا[3]

---

[1] صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد ۱۔ ص ۲۳۰۔ [2] بخاری جز ۱۔ ص ۲۶۔

[3] بخاری جز ۱۔ ص۔ ۱۴۸۔

ہے،، [1]

ایک مرتبہ آپ خطبہ دے رہے تھے اور لوگ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر سن رہے تھے، لیکن ایک شخص کھڑا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے نذر مانی ہے کہ ہمیشہ کھڑا رہے گا، سائے میں نہ بیٹھے گا، کسی سے بات چیت نہ کرے گا، اور روزہ رکھے گا۔ آنحضرت نے حکم دیا کہ اس کو بیٹھنا چاہیئے۔ سائے میں آنا چاہیئے۔ گفتگو کرنی چاہیئے اور روزہ کو بھی پورا کرنا چاہیئے۔ [2]

اسی طرح آپ کو ایک شخص نظر آیا جس کو ایک آدمی ناک میں نکیل ڈال کر خانہ کعبہ کا طواف کرا رہا تھا۔ آپ نے اس کی ناک کی رسّی کاٹ دی اور فرمایا " اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔ " [3]

لیکن ان بدعات سے زیادہ ان اصولوں کا مٹانا ضروری تھا جن کی بنا پر بدعات پیدا ہوتی ہیں۔ بدعت کا سب سے بڑا سرچشمہ تشدد آمیز مذہبی انہماک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے نظامِ عبادت کو نہایت سہل و آسان طریقے پر قائم کیا ہے، اس لحاظ سے اگرچہ خود اسلام کے سنگ بنیاد پر بدعت کی عمارت نہیں قائم کی جا سکتی تھی، تاہم ابتدا میں ہی صحابہ کا ایک پرجوش و مخلص گروہ نہایت شدت کے ساتھ عبادت میں معروف

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ۔ ص ۔ ۱۷   [2] بخاری جزء ۸ ۔ ص ۔ ۱۴۳ ۔

[3] بخاری جزء ۸ ۔ ص ۱۴۳

بدعت

نظام مذہبی کا سب سے زیادہ خطرناک مرض بدعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگر اسلام اس مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتا تھا تاہم جاہلیت کے زمانے کی بہت سی بدعتوں کی جھلک کبھی کبھی نظر آجاتی تھی۔ اس لئے آپ ہمیشہ ان کے مٹانے میں مصروف رہتے تھے۔

بدعت اگرچہ مختلف قسمیں اور مختلف مظاہر ہیں، لیکن اس کی بدترین شکل رہبانیت ہے، جو یہود و نصاریٰ کے مذہب کا جزبن گئی ہے ورھبانیۃ ابتدعوھا۔ عرب پر چونکہ یہود و نصاریٰ کا اثر غالب تھا، اس لئے وہاں اس قسم کی بدعات پیدا ہوگئی تھیں۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جا رہا تھا۔ آپ نے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے کہا "اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی ہے۔ ضعف کی وجہ سے بیٹوں کے سہارے چلتا ہے" آپ نے فرمایا "اس نے اپنے آپ کو کیوں عذاب میں مبتلا کر دیا ہے؟ خدا اس سے بے نیاز ہے" عقبہ بن عامر کی بہن نے خانہ کعبہ تک ننگے پاؤں پیدل جانے کی منت مانی، اور عقبہ کو آنحضرت کے پاس بھیجا کہ پوچھ آئیں۔ آنحضرت نے فرمایا "سواری پر بھی جا سکتی

ضروری خیال کی جاتی تھی۔ اس لئے بدعات کے ساتھ ساتھ ان کا بھی انسداد کیا گیا۔

عرب کے جذبات نہایت لطیف و رقیق تھے۔ اس لئے وہ اعزہ و اقارب کی موت سے نہایت متاثر ہوتے تھے۔ جس کا اظہار مختلف حیثیتوں سے کیا جاتا تھا۔ عورتیں نہایت شدت کے ساتھ میت پر گریہ و بکا کرتی تھیں منہ نوچنا، بال منڈوا ڈالنا، گریبان چاک کر دینا، شوہر کی موت پر برسوں تک خاص خاص پابندیوں کے ساتھ گھر سے باہر رہ کر ماتم کرنا، عرب کی عورتوں کا عام شعار تھا۔ آنحضرتؐ نے ان تمام رسوم کو نہایت سختی سے مٹایا لیکن شخصی حالتوں کے علاوہ میت پر قومی حیثیت سے بھی ماتم کیا جاتا تھا۔ یعنی قبیلہ کی بہت سی عورتیں جمع ہو کر میت کے محاسن و فضائل بیان کرتیں اور باہم روتی تھیں، اسی رسم کا نام "نیاحہ" ہے۔ آنحضرتؐ کے زمانے تک یہ رسم قائم تھی۔ لیکن آپ کے سامنے جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تو اس طرح کی عورتوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ کی

حضرت ام سلمہؓ کو جب اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی تو یہ حسرت بولیں وہ مسافر مسافرت میں مرا، اس پر اس قدر گریہ و بکا کروں گی کہ یادگار رہے۔ چنانچہ اس غرض سے اٹھیں تو عرب کے دستور قدیم کے مطابق ایک عورت نے گریہ و بکا میں ان کا ساتھ دینا چاہا۔ آنحضرتؐ نے دیکھا تو فرمایا: "کیا اس گھر میں شیطان کو داخل کرنا چاہتے ہو۔ جس سے خدا نے اس کو نکال دیا ہے"[1]

---

[1] صحیح مسلم۔ جلد ۱۔ ص ۳۴۴

رہنا چاہتا تھا جب آنحضرتؐ نے ایک دن چھوڑ کے روزہ رکھنا شروع کیا، تو اکثر صحابہ نے بھی اس کی تقلید کی لیکن آپ کو نظر آیا کہ یہی چیز بدعت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ آپ نے صحابہ کو سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس پر بھی لوگ باز نہیں آئے۔ تو معمول کے خلاف متصل روزہ رکھنا شروع کر دیا۔ کہ لوگ خود گھبرا کر باز آجائیں گے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو کثرت صوم و صلوٰۃ اسی بنا پر روک دیا تھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالدرؓ رضی اللہ عنہ کو بھی شدتِ زہد سے منع فرما دیا تھا۔ اور آپؐ نے ان کی تائید کی تھی ؎

رسم و رواج کا انسداد

رسم و رواج کو جب استحکام ہو جاتا ہے تو بدعات کی طرح ان کا چھوڑنا بھی نہایت شاق گزرنے لگتا ہے۔ والا کم۔ اکثر حالتوں میں وہ بدعات سے کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں۔ اور بڑی قیامت یہ ہے کہ بعض اوقات مذہبی حیثیت پیدا کر لیتی ہے۔

عرب میں بہت سی مضر رسمیں قائم ہو گئی تھیں جن کی پابندی نہایت

لہ بخاری جز ۸۔ ص ۱۴۴۰   لہ بخاری جز ۸۔ ۳۲

اتاروں گی؟ بولیں "نہیں" تو آپ نے فرمایا "پھر واپس جاؤ"۔[1]

عرب کی فخر پسند طبیعت ہمیشہ باپ دادا کے کارناموں کا ذکر نہایت بلند آہنگی سے علی رؤس الاشہاد کرتی تھی یہاں تک کہ زمانۂ حج میں بھی یہ داستان پارینہ دہرائی جاتی تھی۔ واذکروا اسم اللہ کذکرکم آباءکم او اشد ذکرا اس کو "منافرت" کہتے تھے فخر و غرور کے اظہار کا یہ طریقہ اکثر بڑی بڑی نزاعیں قائم کر دیتا تھا۔ اسلام نے اس رسم کو بالکل ہی مٹا دیا۔ لیکن اس کا اثر مختلف صورتوں میں پھیل گیا تھا منجملہ ان کے ایک صورت یہ تھی کہ باپ دادا کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے بھی قسم کھائی۔ آپ نے فرمایا خدا باپ کے نام کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، صرف خدا کی قسم کھانی چاہئیے۔ ورنہ خاموشی بہتر ہے۔

اصلاحِ اخلاق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد اصلاحِ اخلاق و تزکیہ نفس تھا، جس کو خود آپ نے ظاہر فرما دیا تھا۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔ میں اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

---

[1] سنن ابن ماجہ ص ۲۶۱

جب حضرت جعفر بن ابی طالب کے قتل کی خبر آئی تو ان کی عورتوں نے اسی طریقہ سے نوحہ کرنا شروع کیا۔ ایک شخص نے آنحضرتؐ کو خبر کی۔ آپ نے منع کرنے کا حکم دیا۔ لیکن وہ ناکامیاب واپس آیا۔ آپ نے اسی غرض سے دوسری مرتبہ پھر اس کو بھیجا۔ اس پر بھی کچھ اثر نہ ہوا تو تیسری بار فرمایا "جاکر ان عورتوں کے منہ میں خاک جھونک دو"[1]

جنازہ کے متعلق بھی اسی قسم کی متعدد رسمیں پیدا ہو گئی تھیں۔ مثلاً اہل عرب جنازہ کے ساتھ سواری پر جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اشخاص کو دیکھا کہ وہ جنازہ کے ساتھ سوار ہو کر جا رہے ہیں۔ فرمایا[2] "کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ فرشتے پیدل ہیں اور تم سواری پر جا رہے ہو؟"

جنازہ کی مشایعت صرف ایک کرتہ پہن کر کرتے تھے۔ اظہار غم کے لئے چادر اتار ڈالتے تھے۔ چادر عرب کا عام لباس تھا۔ آنحضرتؐ نے اسی وضع میں چند اشخاص کو دیکھا تو فرمایا: "کیا جاہلیت کے طریقے پر عمل کر رہے ہو؟"[3]

جنازہ میں عورتیں بھی عموماً شریک ہوتی تھیں، چنانچہ آپ نے چند عورتوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو پوچھا "کیوں بیٹھی ہو؟" بولیں ایک جنازہ کا انتظار ہے۔ فرمایا، "کیا اس کو غسل دو گی؟" ان سبھوں نے کہا "نہیں"۔ پھر فرمایا۔ "تو کیا لاش کو کاندھا دو گی؟" ان سبھوں نے کہا "نہیں" پھر فرمایا "تو کیا لاش کو قبر میں

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱۔ ص ۳۰۴۔ [2] سنن ابن ماجہ۔ ص ۲۵۰۔
[3] سنن ابن ماجہ ص۔ ۲۵۱

سے اس میں دستہ لگایا، اور حکم دیا کہ "جنگل میں جاکر لکڑی کاٹو اور پھر ۱۵ دن تک میں تمہاری صورت نہ دیکھوں" وہ لکڑی کاٹ لایا اور اس کو فروخت کیا۔ دس درہم ہاتھ آئے۔ اس رقم کو لے کر آنحضرت (صلعم) کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے فرمایا "اس رقم سے کچھ غلہ اور کچھ کپڑا خرید کر کھاؤ پہنو، گداگری سے یہ بہتر ہے وہ تو آدمی کے چہرے کا داغ ہے۔ صرف اپاہج لوگوں کے لئے ہی جائز ہو سکتی ہے[1]"

رشوت خواری

عدل و انصاف کی بربادی اور ظلم کی روح خبیث کا سب سے بڑا سبب رشوت خواری ہے عہد نبوت میں چوں کہ آنحضرتؐ کے فیض صحبت سے صحابہؓ کا معیار اخلاق نہایت بلند ہو گیا تھا۔ اس لئے رشوت خواری کی مثالیں نہیں ملتیں۔ تاہم جب کبھی کسی کے طرز عمل پر رشوت کا شبہ بھی ہوتا تھا تو آنحضرتؐ اس پر تنبیہ فرماتے تھے۔ حکام و عمال کو اکثر رشوتیں نذر و ہدیہ کے ذریعہ دی جاتی ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا آپ نے قبیلۂ ازد کے ایک شخص کو صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا، اس نے واپس آکر آنحضرت کے سامنے صدقہ کا مال پیش کیا اور کہا اتنا مسلمانوں کا مال ہے اور اس قدر مجھے ہدیتاً ملا ہے" چوں کہ اس قسم کا ہدیہ رشوت کا ذریعہ بن سکتا تھا، اور اگر علانیہ اس کا انسداد نہ کیا جاتا تو اور لوگ بھی اس

[1] سنن ابن ماجہ۔ ص ۔ ۱۶۲

اور یہ مقصد ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔ اصولی طور پر آپ نے اخلاق کے متعلق جو اصلاحیں کیں، وہ ان کے علاوہ ہے۔ جزئی طور پر جب کسی شخص سے کسی قسم کی بداخلاقی کا ظہور ہوتا تھا تو آپ فوراً اس کو تنبیہ فرما دیتے تھے چنانچہ احادیث میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، جن کے جزئیات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

انسداد گداگری

اسلام نے زکوٰۃ کا ایک مستقل نظام قائم کر دیا کیونکہ خاص خاص لوگ اس کے حقیقی مستحق تھے، لیکن عام طور پر اسلام گداگری اور مفت خواری کو نہایت ذلیل پیشہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیر مستحق لوگوں کو اس سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک انصاری نے آپ سے سوال کیا، آپ نے پوچھا "تمہارے گھر میں کچھ پونجی بھی ہے" اس نے کہا "ایک ٹاٹ ہے جس کو اوڑھتا بچھاتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں" آپ نے فرمایا "اس کو جا کر لے آؤ" وہ جا کر اٹھا لایا، آپ نے تمام صحابہ کے سامنے اس کو بغرض فروخت پیش کیا۔ ایک صحابی نے ایک درہم پر لینا چاہا، دوسرے صحابی نے قیمت میں اضافہ کر کے دو درہم پر لے لیا۔ آپ نے دونوں درہم اس انصاری کے حوالہ کر دیے اور فرمایا "ایک درہم کا غلہ کر گھر میں دے آؤ۔ دوسرے درہم کا ایک بسولہ خرید کر میرے پاس لاؤ" وہ بسولہ خرید کر لایا۔ آپ نے خود دست مبارک

حفظ الید وحفظ اللسان:-

اسلام نے ایک عظیم الشان اخلاقی اصول یہ قائم کیا تھا۔

المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ — مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔

اس اصول کی خلاف ورزی کا اثر اگرچہ ہر موقع پر بُرے نتائج پیدا کرتا ہے تاہم برابر درجہ کے لوگ انتقام لے کر اپنے دل کو تسلیں دے لیتے ہیں مگر زیردستان کو تو اس کا بھی موقع نہیں مل سکتا چنانچہ اس قسم کے موقعوں پر جب کوئی شخص اس اخلاقی جرم کا مرتکب ہوتا تھا۔ فوراً ٹوک دیتے تھے حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے غلام کو ماں کی گالی دی آپ نے فرمایا "تم اس کو گالی دیتے ہو تم میں۔ زمانہ جاہلیت کا اثر ابھی باقی ہے تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے سپرد کیا ہے۔ جو تم کھاؤ۔ وہی ان کو کھلاؤ جو تم پہنو، وہی ان کو پہناؤ۔ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو، اگر لیتے ہو تو ان کی اعانت کرو[1]"

حضرت ابومسعود انصاری کہتے ہیں" میں اپنے غلام کو مار رہا تھا۔ یکایک پیچھے سے آواز آئی کہ اے ابومسعود! ہوشیار! خدا کو تم پر اس سے زیادہ قدرت

[1] بخاری جز ۱ ص ۱۱

طریقہ سے فائدہ اٹھاتے اس لئے آپ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا "اس عامل کو دیکھو جو کہتا ہے کہ یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مال میرا ہے۔ ذرا وہ اپنے گھر میں تو بیٹھ کر دیکھے کہ اس کے پاس ہدیہ آتا ہے یا نہیں[1]؟

خیانت کا انسداد:-

معاملات میں سب سے زیادہ خیانت، چالاکی، اور فریب کا موقع تجارتی کاروبار میں مل سکتا ہے۔ اس لئے آنحضرت خاص طور پر اس کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ بازار میں سے گذرے اور ایک شخص کے غلہ کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کے دیکھا تو نمی محسوس ہوتی چوں کہ بھیگنے سے غلہ کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا "جو شخص دھوکا دیتا ہے، وہ ہم سے نہیں ہے[2]"۔

عرب میں چوں کہ غلہ بہت کم آتا تھا، اس لئے جب باہر سے سوداگر غلہ لاتے تھے تو لوگ شہر سے باہر ہی تخمیناً خرید لیتے تھے، لیکن اس سے کئی طرح کے نقصانات پیدا ہوتے تھے۔ اولاً تو شہر محروم رہ جاتا تھا، دوسرے یہ ایک غیر معین و غیر معلوم بیع تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا۔ آپ عموماً لوگوں کو اس پر سزا دیتے تھے[3]۔

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ۔ ص ۱۱۲ ‏[2] سنن ابن ماجہ ص ۱۶۰ [3] بخاری جزء ۳ ص ۳۰

اسی سادگی کی تعلیم دیتے تھے، اور جب کبھی کوئی چیز اس کے خلاف نظر سے گذرتی تو اس سے بیزاری ظاہر فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ آپ راستے سے گذرے تو ایک بلند عمارت نظر آئی۔ آپ نے فرمایا کس کا مکان ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام لیا۔ آپ خاموش ہوگئے لیکن دل میں بات رکھ لی۔ وہ انصاری آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کیا، آپ نے منہ پھیر لیا۔ انھوں نے کئی بار سلام کیا لیکن آپ کا اعراض بدستور قائم رہا۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے آنحضرت کی ناراضی کا سبب پوچھا تو لوگوں نے واقعہ بیان کیا۔ وہ فوراً گئے اور اس مکان کو منہدم کر دیا۔ آپ دوسری بار اس طرف سے گذرے تو فرمایا کہ وہ عمارت کیا ہوگئی؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! صاحب خانہ نے آپ کی ناراضی کے خوف سے اس کو گرادیا۔ آپ نے فرمایا! ہر وہ گھر جو ضرورت سے زائد ہو صاحبِ خانہ پر وبال ہے[1]۔

ایک مرتبہ آپ کسی لڑائی سے واپس آئے، حضرت عائشہ نے شوق و محبت سے گھر کو ایک نہایت رنگین پردے سے سجادیا۔ آپ تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے سلام کیا، لیکن آپ کے چہرے سے ناراضی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور سلام کا جواب تک نہیں دیا۔ پھر خود اپنے دستِ مبارک سے پردے کے دو ٹکڑے کر دیئے اور فرمایا کہ خدا نے ہم کو مٹی اور پتھر کے آراستہ کرنے کا حکم نہیں دیا ہے[2]۔

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۳۵۶۔ [2] ابوداؤد جلد ۲۔ ص ۲۱۶۔

حاصل ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو آنحضرتؐ تھے حضرت ابو مسعودؓ پر اس کا یہ اثر پڑا کہ انہوں نے غلام کو آزاد کر دیا۔[1]

مداحی کا انسداد

انسان خوشامد پسند ہے، اور مداحی اس دبی ہوئی چنگاری کو اور بھی ابھار دیتی ہے۔ امرا و سلاطین کو اسی نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود مدح سے نفرت تھی، اور لوگوں کو بھی اس سے منع فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک آدمی نہایت مبالغہ آمیز طور پر ایک شخص کی مدح کر رہا تھا، آپ نے دیکھا تو فرمایا تم نے اس کو ہلاک کر دیا۔[2]

عیش پرستی کا انسداد

عیش پرستی بظاہر تمدن کا زیور ہے، لیکن درحقیقت اس کے اندرونی نظام کا اصلی گھن یہی چیز ہے۔ آنحضرتؐ کی زندگی نہایت سادہ تھی، آپ تمام لوگوں کو

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۷۷۔ [2] بخاری جز ۳ ص ۱۷۷

یورپ کو آج اپنے تہذیب وتمدن پر بڑا ناز ہے اگر چہ یورپ کی اخلاقی حالت کے اصلی منظر نہایت نفرت انگیز ہیں۔ بظاہر ہر انگریز کو ستر عورت کا خیال رہتا ہے اور کسی نے کسی انگریز کو راہ میں برہنہ تن بہت کم دیکھا ہوگا، لیکن اسلام کی تہذیب اس بارے میں صرف نمائشی لباس آرائی ہی کو کافی نہیں سمجھتی ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو میدان میں برہنہ نہاتے ہوئے دیکھا، فوراً منبر پر تشریف لائے اور ایک عام خطبہ دیا۔

ان اللہ حی ستیر	خدا صاحب حیا اور پردہ دار ہے
یحب الحیاء والستر	وہ حیا اور ستر پوشی کو پسند کرتا ہے
فاذا غسل احدکم فلیستتر	پس تم میں سے جو کوئی غسل کرے چاہیئے

کہ پردہ ڈال لیا کرے۔

آنحضرتؐ کو ستر عورت کا اس قدر خیال تھا کہ ایک مرتبہ مسور بن مخرمہ نے ایک بھاری پتھر اٹھایا۔ اس حالت میں ان کا کپڑا اگر گیا آپ نے فوراً ٹوکا کہ کپڑا اٹھاؤ برہنہ نہ ہو لیکن یورپ کی ستر پوشی کا یہ حال ہے کہ غسل خانوں، حماموں، بحری ساحلوں، اور پیراکی کے حوضوں میں صدہا متمدن انسان برہنہ ہوکر ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں۔

سنن ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۰۱

مسلم جلد ۲۔ ص ۲۴۴۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی اسی قسم کے مواقع پیش آئے ہیں۔

عفت و عصمت

اسلام پاک بازی اور عفت کی تعلیم دینے کے لئے آیا تھا۔
والذین لفروجہم کامیاب مسلمان وہ ہیں جو عفیف
حٰفظون۔ اور پاک باز ہیں۔
اس بنا پر جب کبھی اس قسم کے مواقع پیش آتے تھے جن سے مسلمانوں کی
اس خصوصیت پر حرف آسکتا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اس
سے تعرض فرماتے۔
حضرت فضل بن بلاس نہایت وجیہ آدمی تھے۔ زمانۂ حج میں آنحضرتؐ
نے ان کو اپنے ساتھ سوار کر لیا تھا۔ ایک خوش رو عورت آنحضرتؐ کی طرف
فتویٰ پوچھنے کے لئے بڑھی۔ فضل نے اس کو شوق کی نگاہوں سے دیکھنا
شروع کیا آنحضرتؐ نے خود دستِ مبارک سے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر ان کا
منہ اُس کی طرف سے پھیر دیا۔[1]

---

[1] بخاری جزء ۸ ص ۵۱

نے فرمایا: یہ مرد کا ہاتھ ہے یا عورت کا؟ اس نے کہا میں عورت ہوں، فرمایا۔ اگر تم عورت ہو تو مہندی لگاؤ۔

اکثر عورتیں نہایت غیر محتاط لباس پہنتی تھیں۔ اس کے متعلق خود قرآن حکیم میں آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی اس قسم کی بے احتیاطی ملاحظہ فرماتے تو فوراً روک دیتے تھے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر آپ کے سامنے باریک کپڑا پہن کے آئیں تو آپ نے منہ پھیر لیا، پھر فرمایا: عورت بلوغ کے بعد صرف منہ اور ہاتھ کھلا رکھ سکتی ہے۔[1]

عورتیں عموماً راستوں میں مردوں کے دوش بدوش چلتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ مرد و عورت دونوں ساتھ ساتھ راہ میں چل رہے ہیں آپ نے فرمایا! "تم کو درمیان راہ میں چلنے کا کوئی حق حاصل نہیں، تم کو راستے کے کنارے چلنا چاہئے۔" اس کے بعد عورتیں دیواروں سے لگ کر چلنے لگیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں۔

رفع نزاع باہمی و اصلاح ذات البین

اسلام نے مسلمانوں پر سب سے بڑا احسان الٰہی یہ جتایا ہے۔

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۱۱۔

اصلاح شیون النساء:-

اس معاملہ میں عورتوں کی حالت مختلف حیثیتوں سے قابل توجہ و محتاج اصلاح تھی۔ عرب میں مخنثوں کا ایک گروہ موجود تھا جو علانیہ گھروں میں آتا جاتا تھا۔ ایک مخنث نے ازواج مطہرات کے سامنے ایک عورت کے محاسن بالکل ایک مرد کی نظر و ذوق سے بیان کئے۔ آنحضرتؐ نے فوراً حکم دیا کہ یہ لوگ گھر میں نہ گھسنے پائیں۔

عرب کی عورتوں میں جو بد اخلاقیاں پھیل گئی تھیں، ان میں ایک بد اخلاقی یہ بھی تھی کہ بعض عورتیں مردوں کی وضع اختیار کرتی تھیں۔ آنحضرتؐ نے ان پر عموماً لعنت بھیجی ہے۔ لیکن جب کبھی کسی عورت کی وضع کو مردوں سے بلا قصد بھی مشابہت ہو جاتی ہے، تو فوراً ٹوک دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ دوپٹہ اوڑھ رہی تھی۔ آپ نے دیکھا تو فرمایا۔

لیۃ، لا لیتین۔ ایک تہ کرکے اوڑھو۔ دوتہ نہ کرو۔

کیوں کہ دوتہ کرنے سے عمامہ کے ساتھ مشابہت ہو جاتی تھی، جو مردوں کی خاص وضع ہے۔ آپ کو اس پر اس قدر اصرار تھا کہ ایک عورت نے پردہ سے آپ کو ایک خط دینا چاہا، اس کے ہاتھوں میں مہندی نہ تھی آپ

صبحاتِ ادب:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑوں کے ادب و تعظیم کا نہایت خیال رہتا تھا۔ معمولی باتوں پر گرفت کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت عبداللہ بن مسعود کے چھوٹے بیٹے نے گفتگو میں مسابقت کرنی چاہی تو آپ نے فوراً ٹوک دیا۔ الکبیر، الکبیر۔ یعنی پہلے بڑے کو بولنے دو!

فاصبحتم بنعمته اخوانا — خدا نے تم کو باہمی دشمنی کے بعد بھائی بھائی بنا دیا۔

لیکن باہمی اختلاف و تنازعہ سے یہ رشتۂ اخوت ٹوٹ سکتا تھا اس لئے آنحضرتؐ کے فرائض اقتدار میں سب سے اہم فرض رفع نزاع تھا۔ چنانچہ جب کبھی آپ کو کسی شر و فساد و خانگی کی خبر ملتی تو آپ جاتے اور اصلاح فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف میں باہم کچھ ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ آپ چند صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے، اور معاملہ کے سلجھانے میں اس قدر دیر لگی کہ نماز کا وقت آگیا چنانچہ حضرت بلال کے درخواست کرنے پر حضرت ابو بکر نے نماز پڑھائی[1]۔

عبد اللہ بن سلول ایک بار نہایت گستاخانہ پیش آیا، یہاں تک کہ صحابہ سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ لڑنے بھڑنے پر تیار ہو گئے، اس پر عبد اللہ بن سلول کے حامی بھی اٹھے، اور فریقین باہم دست و گریباں ہو گئے۔ لیکن آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر الگ کیا اور فرمایا کہ صلح فساد سے بہتر ہے[2]۔

واقعہ افک کے متعلق خود مسلمانوں کے دو قبیلوں اوس و خزرج میں سخت نزاع قائم ہو گئی، اور دونوں فریق آمادۂ جنگ ہو گئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھا کر ٹھنڈا کیا۔

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۱۸۔

[2] ابو داؤد جلد ۲ ص ۲۱۱

کو صرف اسی لئے قائم کیا گیا ہے - تاکہ میزانِ عدل کی نگرانی کرے اور بدی کے درخت کو بڑھنے اور پھیلنے سے روکے -

جہاد اسلامی اسی احتساب کی ایک اصولی حقیقت ہے - امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی کا نام ہے، اور یہی وہ قوت معلمہ و مربیہ ہے جو امت مسلمہ کے ہر فرد کو سپرد کی گئی - اور ان کی نسبت فرمایا کہ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر

گزشتہ نمبر میں ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے چند متفرق واقعات جمع کرکے کوشش کی تھی کہ آپ کی زندگی کو ایک "محتسب" زندگی کے لحاظ سے پیشِ نظر رکھ سکیں، اور بحیثیت سچائی کے ایک محتسب ہونے کے جو اسوۂ حسنہ آپ نے قائم کیا ہے، اس کے بعض اہم جزئیات قوم کے بعض واضح ہو سکیں - اسی سلسلے میں آج صحابہ کرام اور تربیت یافتگان آغوشِ نبوت کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں، تاکہ مومنوں اولہ کا نمونہ بھی اس بارے میں واضح ہو جائے - یہ میدان نہایت وسیع ہے ہم سردست خلافِ راشدہ کی تربیت تاریخی اختیار کریں گے، اور سب سے پہلے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے سلسلہ شروع کریں گے -

اسوۂ صدیقی بحیثیت محتسب

حضرت ابوبکر صدیق کی ذات درحقیقت آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ کا ایک

تربیت یافتگانِ عہدِ نبوّت
کا
اسوۂ حسنہ

احتساب کے معنی یہ ہیں کہ انسان نیکی کا محافظ ہو، اور بدی کی ہر شکل اور ہر نمود کو فنا کرنے کا اپنے اندر ایک اَن تھک عشق رکھے۔ وہ سب سے پہلے خود اپنے نفس کا محتسب ہو، پھر اپنے خاندان کا، اپنے ہمسایوں کا، اپنے محلہ کا، اپنی قوم اور پھر تمام کرۂ ارضی کا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔

وہ ہمیشہ دنیا کے ہر اعتقاد و عمل کا احتساب کرے، یعنی ہمیشہ نگراں رہے کہ نیکی اور راستی کی راہ سے انحراف تو نہیں ہو رہا؟

اگر اس کو سچائی اور عدالت سے انحراف نظر آئے، تو وہ اپنے ہاتھ سے اپنی زبان سے، اپنی تمام قوتوں سے اس انحراف کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ کیوں کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی سچائی کا محافظ و ذمہ دار ہے۔ اور اس کے وجود

کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ حضرت ابوبکر ہمیشہ اس فرض کے ادا کرنے میں سرگرم رہتے تھے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: "میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ اپنے گھر کو مسلمان ہی پایا۔" یہ حضرت ابوبکر کی اسی ہدایت اور ارشاد و احتساب کی برکت تھی، ورنہ اس وقت صدہا خاندان تھے جن کا کوئی ایک شخص تو مسلمان ہو گیا تھا لیکن تمام گھرانا بدستور کفر میں مبتلا تھا۔ حضرت عائشہ باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آچکی تھیں، اور اب ان کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہدایت و ارشاد کی ضرورت نہ تھی، تاہم جب کبھی ان سے کوئی لغزش ہو جاتی تو نہایت سختی کے ساتھ تنبیہ کرتے تھے۔

حضرت عائشہ آنحضرتؐ کے ساتھ کسی سفر میں تھیں۔ ان کا ہار گم ہو گیا۔ آنحضرتؐ اور صحابہ اس کی تلاش کے لئے رک گئے اتفاق سے اس جگہ پانی کا کوئی سامان نہ تھا۔ صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق سے شکایت کی۔ وہ آئے تو دیکھا کہ آنحضرت

حضرت عائشہ کے زانو پر ابوبکر صدیق سے شکایت کی وہ آئے تو دیکھا کہ آ-

ضبط نہ ہو سکا اور حضرت عائشہ کو بہت ملامت کی کہ "تو نے اپنے ہار کے لئے تمام لوگوں کو اس قدر پریشان کیا"، چنانچہ اس موقعہ پر آیت تیمم نازل ہوئی تھی۔ اور تمام صحابہ پکار اٹھے تھے۔

"ما ھی باول برکتکم یا آل ابی بکر"

یعنی اے خاندان ابوبکر! تمہاری یہ پہلی ہی برکت نہیں ہے کہ حکم تیمم کے نزول کا باعث ہوئے۔ اس سے پہلے بھی تمہارا وجود برکتوں کا سرچشمہ رہ چکا ہے۔

لہ صحیح بخاری جلد ۱ - ۱ - ۷ -

مکمل پر تو ہے۔ فطرتِ صالحہ نے جاہلیت ہی کے زمانے سے ان کے دل میں فرض احتساب کے ادا کرنے کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اسلام نے ان چھپے ہوئے شرارون کو چمکا دیا، اور وہ مسلمان ہونے کے ساتھ ہی محتسب اعظم بن گئے۔

تزکیۂ نفس:۔

ان کو تزکیۂ نفس کا (جو احتساب کی پہلی شرط ہے) اس قدر خیال تھا کہ ان کے غلام نے ایک بار ان کو کچھ مال لا کر دیا۔ اس کو حضرت ابوبکر نے اپنی وجہ معاش میں صرف کر دیا، غلام نے کہا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیسا مال تھا؟" انہوں نے کہا "مجھے کچھ خبر نہیں" اس نے کہا "میں جاہلیت کے زمانے میں عرب کے کاہنوں کی طرح مکر و فریب سے غیب کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ آج ایک شخص نے اسی کا معاوضہ دیا۔ اور آپ نے اپنا وجہ معاش میں خرچ کر لیا" حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسی مال کی معاش سے کچھ غذا اس وقت کھائی تھی۔ جوش میں آ کر اپنی انگلیاں حلق میں ڈال دیں، اور جو کچھ کھایا تھا، قے کر کے نکال دیا۔ (بخاری)

اصلاح خاندان:۔

شرائط احتساب میں اپنے نفس کی اصلاح کے بعد اصلاح خاندان

اللہ تعالیٰ۔ ما محمد الا رسول [1] چاہئے کہ ان کا خدا ابتک زندہ ہے اور کبھی نہ مریگا۔ خدا خود کہتا ہے کہ محمد تو صرف ایک پیغمبر ہیں، جیسا کہ ان سے پہلے پیغمبر آئے اور اپنا فرض نبوت ادا کر کے دنیا سے چلے گئے۔

صحابہ کہتے ہیں کہ "اس خطبہ کے بعد لوگوں کو ایسا محسوس ہوا گویا یہ آیت بالکل نئی ہے جو کبھی نازل ہی نہیں ہوئی تھی" ان کی زبان سے وہ کچھ اس طرح بر وقت ادا ہوئی کہ ہر شخص کے دل میں اتر گئی اور ہر زبان میں آ گئی اور ہر زبان نے اس کو بار بار دہرایا!

غالباً اسی ضبط و استقلال کا اثر تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں انہی کی بیعت کے لئے سب سے پہلے ہاتھ بڑھایا۔

خلافت کے بعد احتساب کا ایک نہایت نازک موقعہ اور پیش آیا۔ یعنی ایک گروہ نے زکوٰۃ روک دی۔ حضرت ابوبکر نے اُن سے جہاد کرنا چاہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا "کلمہ گویوں کے ساتھ کیونکر جہاد کیا جا سکتا ہے؟" لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صاف کہہ دیا "جو لوگ نماز اور زکوٰۃ میں ذرہ برابر بھی تفریق کریں گے، اور ایک بکری کا بچہ بھی روک لیں گے۔ میں ان سے مقابلہ کروں گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بعد میں ان کی اصابت رائے کو تسلیم کرنا پڑا [2]

ان اہم مواقع کے علاوہ احتساب کے اور بھی جزئی موقعے عہدِ نبوت میں پیش آئے، اور انہوں نے اس فرض کو ادا کیا۔ صحابہ کرام کے پیغمبرانہ اعمال کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ تمام واقعات کو جمع کرنا ممکن نہیں۔ عید کے دن کچھ عورتیں حضرت عائشہ کے گھر میں گا رہی تھیں، حضرت ابوبکر آئے اور ان کو ڈانٹ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] بخاری جزء ۲ ص ۲۔ کتاب الجنائز۔ [2] بخاری جزء ۲ ص ۱۰۲۔ کتاب الاعتصام

احتساب ملت

قوم کی ہدایت و ارشاد کے لئے انھوں نے ایسے نازک موقعہ پر فرض احتساب ادا کیا کہ خود حضرت عمر جیسے ضابطہ اور مستقل شخص کے ہوش و حواس بھی پراگندہ ہو گئے تھے آنحضرت کے انتقال کے وقت اسلام ایک ۔ یہ مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا چھپے ہوئے دشمنوں کے مخفی جذبات میں جنبش پیدا ہو گئی تھی، اور اگر ضبط و استقلال کے ساتھ ارکانِ اسلام کو قائم نہ کر دکھایا جاتا ہے۔ تو دشمنانِ حق اس مہلت کو اپنے دیرینہ حوصلوں کی شکار گاہ بنا لیتے۔ لیکن اس اہم غرض کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی، اور محبوب رب العالمین کے فراق نے تمام صحابہ کو سرگرداں و حیران بنا دیا تھا۔ ایسی حالت میں حضرت ابوبکر صدیق ہی کا دماغ تھا جو سکون کی حالت میں تھا۔ محبت اور جذبہ عقیدت کا اظہار انھوں نے آنحضرت کے جسد اطہر کو چوم کر دیا تھا لیکن اسلام کی حفاظت اس سے بھی زیادہ مقدم تھی۔ چنانچہ ابھی آپ دفن بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ صحابہ کے مجمع میں تشریف لائے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پریشانی کی کی حالت میں صحابہ سے کچھ خطاب کر رہے ہیں انھوں نے روکا، وہ باز نہیں آتے۔ پھر بھی انھوں روکا، وہ باز نہیں آتے، پھر روکا پھر بھی انھوں نے توجہ نہ کی اب مجبور ہو کر خود ایک خطبہ دیا۔ جس نے تمام صحابہ کو ان کے آگے ہمہ تن گوش بنا دیا۔

اما بعد کان منکم یعبد محمداً	جو لوگ تم سے محمدؐ کو پوجتے تھے تو انہیں معلوم
صلی اللہ علیہ وسلم فان محمداً صلی	ہو کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے دنیا کے
اللہ علیہ وسلم قد مات، ومن کان	ساتھ ان کے اسلام کا بھی خاتمہ ہو چکا لیکن
یعبد اللہ فان اللہ لا یموت قال	جو لوگ خدا کے پوجنے والے تھے، ان کو تسکین ہونا
المتفاہ ر ۱۱۱	

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً تلوار سنبھالی اور آنحضرت سے عرض کیا، اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں[1]"

ایک غزوہ میں عبداللہ بن ابی نے کہ منافقوں کا لیڈر تھا، کہا[2] "مدینہ چل کر محمد (صلعم) کو نکال دیا جائے گا" حضرت عمر نے فوراً آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی[3] "حکم دیجئے کہ اس منافق کا فیصلہ کر دوں" لیکن رحمۃ العالمین نے دونوں موقعوں پر ان کو روک دیا۔

احتساب کے لئے نرمی و ملاطفت کے ساتھ بہت زیادہ دلیری، آزادی اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت عمرؓ میں احتساب کی یہی آخرالذکر شان زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جس کے بغیر کوئی انسان سچائی کا محتسب نہیں ہوسکتا۔ اسیران بدر اور صلح حدیبیہ کے واقعہ میں انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے جس طرح اختلاف کرنے کی جرأت کی، اس کا حال ہر اس شخص کو معلوم ہے جس نے صحاح کا مطالعہ کیا ہے جب آنحضرت نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھنی چاہی تو دیکھو کہ [illegible] بے اختیار دامن پکڑ کے روک لیا ہے

تمام صحابہ کو کم و بیش احتساب کے ادا کرنے کا خیال تھا لیکن کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ آنحضرتؐ کی بیویوں کے معاملے میں بھی روک ٹوک کرتا۔ اس معاملہ میں صرف حضرت عمرؓ تمام صحابہ کے اندر ممتاز نظر آتے ہیں۔ حضرت سودہ کو باہر نکلنے پر انہی نے ٹوکا اور خود آیت حجاب نے بھی ان کی تائید کی یہاں تک کہ خود حضرت ام سلمہ کو ایک بار شکایت کرنا پڑی کہ اے عمر! اب تم اس قدر بڑھ چلے ہو کہ ازواج مطہرات اور خود آنحضرتؐ کے

---

[1] بخاری جز ۸۔ ص ۔۸۰، [2] بخاری جز ۵۔ ص ۵۰۴ [3] بخاری جز ۱۔ ص ۔ و [4] بخاری جز ۸ ص ۵۴

نے ان کو گانے کی اجازت دیدی[1]۔

ایک مرتبہ ایک عورت کے پاس سے گذرے۔ دیکھا کہ وہ بالکل خاموش ہے لوگوں سے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے عرب کے قدیم طریق رہبانیت پر خاموش حج کیا ہے انہوں نے اس سے کہا "یہ جائز نہیں، یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا[2]"

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس فرض کے ادا کرنے پر ان کو اسلام کی قوت یا خلافت کی سطوت نے اس قدر دلیر کر دیا تھا، بلکہ یہ قوت خلافت سے پہلے بھی ہمیشہ اسی طرح اپنا عمل انجام دیتی رہی۔ ابتدائے اسلام میں جب اسلام کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا، اس وقت بھی انہوں نے اسی دلیری کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ عقبہ بن معیط نامی ایک شقی آیا اور آپ کی اس مقدس گردن کو پکڑ کر زور سے دبایا جس کے اندر سے تمام کائنات ارضی کی سعادت کی صدائیں نکلتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ فوراً لپکے اور ہاتھ پکڑ کر اس کو دور پھینکا اور کہا "آہ، تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب صرف خدا ہے[3]"

اسوۂ احتساب فاروقی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تھے تو ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اسلام لانے کے بعد بھی وہ تلوار ان کے ہاتھ میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

ہم حدیثوں میں قدم قدم پر پڑھتے ہیں کہ جب کسی نے شان اسلام کے خلاف کوئی بات کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً تلوار اٹھالی۔ حاطب بن بلتعہ نے مدینہ سے اہل مکہ کو ایک خط لکھا، جس سے ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات معلوم ہو گئے۔

---

[1] بخاری جز ۲-۳ ص ۱۶۴ [2] کتاب للعالمین [3] بخاری جز ۵ ص ۱۰

حضرت ابوہریرہ نے جب کثرت سے روایتیں کیں، تو انھوں نے صاف صاف کہہ دیا:
"اب اگر تم نے احتیاط نہ کی تو کوڑوں سے پٹوا کر نکلوا دوں گا۔"

ایک حضرت ابوموسیٰ اشعری نے ان کو تین بار سلام کیا، وہ مصروف تھے جواب نہیں دیا۔ وہ واپس چلے گئے۔ فارغ ہوتے تو بلا کر واپس جانے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا "آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ تین بار اجازت طلب کرنے پر اگر اجازت نہ ملے تو واپس جاؤ۔" حضرت عمر نے کہا "اس حدیث کی صحت پر گواہ لاؤ" چنانچہ ابوسعید خدری نے شہادت دی، تو ان کا دامن چھوڑا گے

دو عورتوں میں زد و کوب ہوئی۔ ایک حاملہ تھی۔ اس کا حمل ساقط ہو گیا حضرت عمر کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے صحابہ سے دریافت فرمایا، کسی نے آنحضرتؐ سے اس کے متعلق کوئی حدیث سنی ہے؟ مغیرہ نے کہا "ہاں آنحضرتؐ نے اس کی دیت ایک غلام یا ایک لونڈی دلوائی تھی" لیکن انہوں نے تسلیم نہ کیا اور اس حدیث پر شہادت طلب کی چنانچہ جب محمد بن مسلم نے گواہی دی تو اس کے مطابق فیصلہ کیا

انھوں نے اس معاملہ میں اس قدر سخت گیری کی کہ بعض موقعوں پر صحابہ چیخ اٹھے۔

لا تکن عذابا علی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی اے عمر! اصحاب رسول کے لئے تم عذاب نہ ہو جاؤ!

حضرت عمر کی نگاہ اگرچہ ہمیشہ اسی قسم کے مبادی امور پر پڑتی تھی تاہم وہ جزئیات احتساب سے بھی بے پروا نہ تھے۔ جب ایک عورت شریک جنازہ ہوئی تو انہوں نے اس کو ڈانٹا کہ تمہاری شرکت کا حکم شرعی موجود نہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

لے تذکرۃ الحفاظ جلد اول تذکرہ عمر فاروق ؓ بخاری جزء ۳ ص ۹۲۵ ؎ بخاری جزء ۹ ص ۱۰۲۰ ؎ ابوداؤد جزء ۱ ص ۹۲۰

معاملے میں بھی دخل دینے لگے ؟"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ میں مستحق ادب خیال کیے جاتے تھے، لیکن ایک موقع پر جب ان کی بہن نے جوشِ غم میں حد شریعت سے تجاوز کر کے نوحہ کیا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو گھر سے نکلوا دیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ آزادی صداقت اور دلیری حق ادب کے منافی نہیں، ورنہ خود حضرت عمر سے زیادہ آنحضرتؐ کا ادب کون کر سکتا تھا؟ اپنی ذات کے علاوہ جب کبھی کسی دوسرے سے کوئی حرکت صادر ہو جاتی جو آنحضرتؐ کے ادب کے ذرا بھی منافی ہوتی تو وہ اس کی برداشت کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں چند عورتیں نہایت اونچی آواز کے ساتھ گفتگو کر رہی تھیں، اتفاق سے حضرت عمرؓ آ گئے، تو سب کی سب بے تحاشا اٹھ کر بھاگ گئیں کہ اس جرأت پر کہیں ان کی تلوار اضطراب کو حرکت نہ ہو جائے۔ انھوں نے کہا اے اپنی جان کی دشمنو! رسول اللہ سے زیادہ مجھ سے ڈرتی ہو؟[2]

حضرت عمر کے کارنامۂ اضطراب میں سب سے زیادہ نمایاں وہ واقعات ہیں جہاں انھوں نے صحابہ کو بہ کثرت روایت حدیث سے روکا ہے۔ حدیث کی روایت جس قدر ضروری ہے، اسی قدر مشکل بھی ہے۔ صحابہ کے زمانہ میں اگرچہ کذب فی الرّوایت کا (یعنی عمداً غلط اور جھوٹ روایت کرنے کا) احتمال نہ تھا۔ تاہم غلطیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اور بعض موقعوں پر غلطیاں پیدا بھی ہوئیں چنانچہ اس کے متعلق حضرت عائشہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عباس کی تنقیدی روایات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے،[3] اسی بنا پر حضرت عمر روایت حدیث کی غیر محتاط کثرت پر نہایت سخت گیری کرتے تھے حضرت

---

[1] بخاری جز ۶ - ص ۱۵۷ [2] بخاری جز ۹ ص ۸۲۰ [3] بخاری جز ۸ ص ۲۳

کی طرح پردے میں رہنے لگے، حضرت عمر کو خبر ہوئی تو اس محل کو جلوا دیا۔ یہ شلوت تھی جو اسلامی احتساب کے نمونوں نے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ یہ امارت اور سلطانی کے بڑے بڑے محل ہی ہیں جن کے اندر انسانیت کی بربادی کی تمام خباثتیں پلیں، اور اور یہی محل ہیں جنھوں نے خلفائے اسلام کی کچی دیواروں کی جگہ بن کر اسلام کی اصلی طاقت کو پاش پاش کر دیا!

اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہیں جن کی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں کی جا سکتی۔

ایک دقیق نکتہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امر بالمعروف والنہی عن المنکر کا یہ طریقہ بتایا ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف	تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر نہ سکے

(الایمان (مسلم جلد ۱ ص ۵۰ کتاب الایمان)

یہ حدیث احتساب مختلف درجوں کی اس قدر جامع ہے کہ ایک صاحب اقتدار بادشاہ سے لے کر ایک ادنیٰ فقیر تک اس کے اندر اپنا حکم اور طریقہ پا لے سکتا ہے، لیکن اس کے علاوہ احتساب کا ایک اور طریقہ بھی ہے جس پر ہر شخص عمل نہیں کر سکتا۔ احتساب کا ہر طریقہ ہاتھ، زبان، یا کم از کم دل کی قوت کا محتاج ہوتا ہے۔

نے اس کو اجازت دے دی[1]

ایک بار طائف کے دو آدمیوں نے مسجد نبوی میں شور و غل کیا۔ حضرت عمر نے ان کو بلوا کر کہا "اگر تم مسافر نہ ہوتے تو میں تم کو سزا دیتا۔ تم مسجد نبوی کے اندر شور و غل کر رہے ہو[2]"

ایک بار حضرت ابن زبیر کے بدن پر حریر کا کپڑا دیکھا تو اس کو پھاڑ دیا۔ ان کے باپ زبیر نے کہا "تم نے بچے کا دل شکستہ کر دیا" فرمایا "بچوں کو حریر نہ پہناؤ" یعنی بچپن سے انھیں عیش و راحت جسم کا عادی نہ کر دو۔ اسلام ہر مسلمان کو سپاہی کی طرح سادہ وضع اور محنت پسند دیکھنا چاہتا ہے[3]

رویشد ثقفی ایک شخص تھا جس نے شراب کی دکان کھولی تھی۔ حضرت عمر نے دکان میں آگ لگوا دی اور فرمایا "تو فویسق ہے نہ کہ رویشد" حضرت علیؓ نے بھی ایک گاؤں کو جلوا دیا تھا جس میں شراب کی تجارت ہوتی تھی[4]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ دودھ میں پانی ملا کر بیچ رہا ہے۔ اس سے چھین کر دودھ کو زمین پر گرا دیا[5]۔

انبیائے سابقین کی جو محرف اور ناقابل وثوق کتابیں عرب میں پھیلی ہوئی تھیں جن سے اسلام میں بھی اختلاط سند بھی پیدا ہو جانے کا خوف تھا۔ حضرت عمر نے ان سب کو جلا دیا۔

کاش اسرائیلیات کا تمام ذخیرہ ملیامیٹ ہو جاتا۔

سعد بن ابی وقاص نے ایرانی ٹھاٹ کے ساتھ ایک محل بنایا اور بادشاہوں

---

[1] سنن ابن ماجہ ص ۱۸۱ [2] بخاری جز ۱ ص ۶۷ [3] الحسبۃ فی الاسلام مجموعہ الاسلام ابن تیمیہ ص ۴۴

ہیں۔ ان کے پاس لوہے کے آلات اور خون ریزی کے اسلحہ میں سے کچھ نہیں ہوتا لیکن یہی قوتِ الٰہیہ ہوتی ہے جو ان کو از سرتاپا ایک شمشیرِ الٰہی بنا دیتی ہے اور ان کا وجود، ان کی نقل و حرکت، ان کی کردار و رفتار، ان کا کھانا پینا، رہنا سہنا، غرض کہ زندگی اور وجود کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک ادا کا اللہ محافظ ہوتا ہے، اور ان کے اندر نیکی کی نافذانہ و عاملانہ قوت کی بجلیاں بھر دیتا ہے۔

انبیاء کرام کے ظہور کا مقصد سعادت انسانی اور سلام ارضی ہے، اس لئے ان کو نبوت کی جس قدر طاقتیں بخشی جاتی ہیں، وہ ان کے کام اور کام کی وسعت کے مطابق ہوتی ہیں، سپہ سالار فوج کو جتنی بڑی فوج سے لڑنا ہوتا ہے، اسی کے مطابق اس کو فوجی سامان بھی دیا جاتا ہے، اور اسی کے مطابق اس کے سپاہیوں کی تعداد اور طاقت بھی ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے جس قدر انبیاء کرام علیہم السلام آئے، ان کا جہاد صرف محدود ملکوں اور قوموں کی گمراہیوں کے مقابلے میں تھا، لہٰذا ان کا سامان جنگ بھی ان کے کام کے مطابق تھا لیکن اسلام تمام کرۂ ارضی کی ضلالت کو نابود کرنے کے لئے تھا، اور تمام نوع بشری کی اصلاح اس کے سامنے تھی۔ پس اس کا پیغمبر بھی تمام پچھلی قوتوں سے زیادہ قوت لے کر آیا، اور تمام پچھلی فوجوں اور فوجی سروسامان سے زیادہ وسیع و عظیم اس کی فوج اور اس کا سامانِ جنگ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرانہ طاقتوں میں سے ہر ایک طاقت پیغمبر اسلام کو زیادہ ملی، اور یہی وجہ ہے کہ اور تمام پیغمبروں کی تیار کردہ جماعت سے کہیں زیادہ طاقتور جماعت اس نے تیار کی۔ اعمالِ نبوت میں سب سے بڑی طاقت یہی ... نفوذ و تربیت ہے، اسی قوت سے وہ دنیا کی تمام شیطانی قوتوں کو نابود کر دیتے ہیں۔

لیکن اس طریقہ میں جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ایک لدنی جوہر مقدس ہے، جو ہر شخص میں پیدا نہیں ہو سکتا۔

ایمان باللہ، انقطاعِ علائق ما سوی اللہ و تقوی، طہارت، زہد و قناعت اور فضائل و اخلاق کی عملی زندگی سے انسان میں ایک خاص کیفیت (الہیہ و راسخہ) پیدا ہو جاتی ہے، جس کو شریعت کی زبان میں روحانیت، اور علم النفس کی اصطلاح میں نفوذ کہتے ہیں۔ جن لوگوں میں روحانیت پیدا ہو جاتی ہے وہ

اپنے وجود کے اندر طاقت و سلطانی کی ایک ایسی نافذانہ قوت پالتے ہیں جو تلوار کی دھار اور آگ کی لپیٹ سے زیادہ مخلوقات پر اثر رکھتی ہے پس اس قوت کے حصول کے بعد وہ انسانوں کے سامنے آتے ہیں۔ تو نیکی کا ایک فرشتہ نمایاں ہو جاتا ہے ان کے حضور میں کبھی برائی سر نہیں اٹھا سکتی، اور کوئی انسان سر نہیں اٹھا سکتا۔ جو لوگ ان کی صحبت میں رہتے ہیں، ان پر اُن کی یہ قوت روحانی از سرتا پا چھا جاتی ہے، اور بسا اوقات اس طرح خیر مجسم بنا دیتی ہے کہ گناہ کی ہوس ہی معدوم ہو جاتی ہے۔

صلحائے امت میں یہ قوت، اعتقاد راسخ اور اعمال صالحہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی ایک خاص حد ہے۔ لیکن حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے ظہور کا مقصد چونکہ اصلاح نفوس ہوتا ہے، اس لئے اللہ ان کی فطرت کے اندر ہی اس قوت کو اس انتہائی حد تک ودیعت کر دیتا ہے جو انسانیت کبریٰ کا درجہ قصویٰ ہے، اور جو صرف انبیاء ہی کے لئے مخصوص ہے۔

وہ جب دنیا میں آتے ہیں تو بغیر کسب و اخذ کے اس قوتِ الہی کا اعلیٰ ترین سرچشمہ ہوتے ہیں، اور ان کے سلطان نفوذ و احاطہ کلی کے آگے بدی کی تمام طاقتیں فنا ہو جاتی

روحانیت کی اس قوت کی اصلی پہچان یہ ہے کہ یہ انسان کے اندر ایک عامل و نافذ طاقت پیدا کر دیتی ہے، اور اس لئے اس کا وجود جس طرح انسانوں کو نیک بنا دینے کے لئے گھیر لیتا ہے، دوسرے انسانوں سے نہیں ہو سکتا۔ وہ وعظ کر سکتے ہیں، ہدایت کر سکتے ہیں، نیکی کی خوبیاں بتا سکتے ہیں، مگر اپنی جلال و سلطانی حق سے چھا کر اسے نیک نہیں بنا دے سکتے۔ صحابہ کرام میں اس قوت حق کے کرشمے ہمیں ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ لیکن خاص طور پر حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہم) اس قوت کا مظہر تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے جب سب سے پہلے تنہا ہجرت کرنی چاہی، تو اسی قوت کا اعتراف تھا جس کی بنا پر ابن دغنہ نے آپ کو جانے سے روکا۔

مثلک یا ابابکر لا تخرج ولا یخرج انک تکسب المعدوم وتصل الرحم وتحمل الکل وتقوی الضیف وتعین علی نوائب الحق فانا لک جار، ارجع واعبد ربک ببلدک (بخاری جزء ۵)	اے ابوبکر! تم جیسا شخص نہ ہجرت کر سکتا ہے اور نہ ہجرت کرنے پر اسکو مجبور کیا جا سکتا ہے۔ تم مفلسوں کو مال دیتے ہو، حقوق رحمی کا لحاظ رکھتے ہو، قوم کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیتے ہو، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہو، مصیبتوں کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہو۔

چنانچہ کفار قریش نے بھی ابن دغنہ کی سفارش سے ان کو اپنے گھر کے اندر عبادت کرنے اور قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی اور اس طرح کفار با وجود

پس اسلام کے پاس اس وقت کا خزانہ بھی سب سے زیادہ وسیع تھا۔ اور اس نے صحابہؓ کرام کی جو جماعت اس قوت سے تیار کی تھی، وہ تمام پچھلی خلفاء نبوت کی جماعتوں سے بڑھ کر اس قوت روحانی کو اپنے اندر رکھتی تھی۔

عہد نبوت کی تاریخ ہمیں اور کچھ نہیں بتلاتی، صرف اسی قوت الٰہی کی ایک روحانی سرگذشت ہے۔ صحابہ کو جس چیز نے اقتساب حق کی پیغمبرانہ قوتوں سے معمور کر دیا تھا، وہ اسی قوت کی تربیت تھی، اور صحابہ کی زندگی کی ایک ایک ادا کے اندر جلوہ افگن ہے وہ اسی قوت معلّمہ و مربّیہ کی متعلّمہ و تربیت یافتہ تصویر تھی۔

حضرت حنظلہ تمیمی فرماتے ہیں "ہم لوگ آنحضرتؐ کی خدمت میں تھے کہ آپ نے جنت و دوزخ کا ذکر اس موثر طریقے سے کیا کہ ہم نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ لیکن میں خدمت مبارک سے اٹھ کر بال بچوں میں آیا تو ان کے ساتھ چہل اور ہنسی مذاق کرنے میں مصروف ہوگیا۔ تو وہ اثر زائل ہوگیا جو آپ کے فیض صحبت نے پیدا کر دیا تھا۔ پھر مجھ کو وہ تذکرے یاد آئے تو میں فوراً اٹھا اور حضرت ابو بکر سے مل کر کہا میں منافق ہوگیا ہوں۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں جو ذوق و شوق مجھ پر طاری ہوگیا تھا، وہ گھر پہنچ کر باقی نہ رہا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "یہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آخر ہم بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں۔"

لیکن حضرت حنظلہؓ ان کے اس جواب سے تسکین نہیں ہوتی۔ انھوں نے براہ راست آنحضرتؐ سے اس کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا "تم لوگوں کی جو حالت میرے پاس ہوتی ہے، اگر یہ قائم رہ جاتی تو تم سے فرشتے راستوں میں مصافحہ کرتے"

(سنن ابن ماجہ۔ ص ۵۷۷)

ایک متفرق نظر

خلافت کے فرائض نے اگرچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و حضرت عمر رضی اللہ کے دائرہ احتساب کو نہایت وسیع کر دیا ہے تاہم صحابہ کا زمانہ خیر القرون تھا۔ اس لئے صحابہ کا ہر فرد سرگرم احتساب رہتا تھا۔ یہاں تک کہ معمولی سے معمولی چیزوں پر بھی روک ٹوک کی جاتی تھی۔

اسلام نے دنیا کی مدنیت صالحہ کو جو ترقی دی ہے، اس کا اثر ایک ایک جزئیات میں نظر آتا ہے۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، ملنے جلنے، غرض ہر چیز میں عرب کی حالت قابل اصلاح تھی، اور اسلام نے اس کی اصلاح کی منجملہ ان تمام اصلاحوں کے ایک جزئی اصلاح یہ بھی تھی کہ کھانے پینے کی حالت میں حرص و طمع کا اظہار نہ ہونے پائے۔ اسی بنا پر آنحضرت نے ایک ساتھ دو دو کھجوروں کے کھانے کی ممانعت فرما دی تھی، کیوں کہ اس سے حرص و طمع کا اظہار ہوتا تھا۔ احادیث کی اصطلاح میں اس کو "قِران" کہتے ہیں۔

ایک مرتبہ قحط کا زمانہ تھا۔ حضرت ابن زبیر لوگوں کو کھجوریں تقسیم کر دیا کرتے تھے، لوگ شدت گرسنگی سے کھاتے تھے، تو تہذیب اور ارشاد نبوی کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب عبد اللہ بن عمر ادھر سے گذرتے لوگوں کو ٹوکتے "آنحضرت نے قِران سے منع فرمایا ہے، البتہ اپنے دوسرے شریک طعام سے اجازت لے کر ایسا کیا جا سکتا ہے۔" (بخاری جز ۳)

انتہا رشقاوت و مخالفت کے خود ان کو ہجرت سے روکنے لگے!

انہوں نے شوق عبادت میں گھر کے اندر ایک مسجد بنائی اور عبادت و قرأت میں مصروف ہو گئے، لیکن جب وہ قرآن پڑھتے تھے تو ان پر خشیت و رقت طاری ہو جاتی تھی۔ اور اس کا روحانی اثر کفار کے بال بچوں پر پڑتا تھا، وہ سب پروانہ وار اس شمع ہدایت پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے۔ یہ حال دیکھ کر کفار کو خوف ہوا کہ ہمارے بال بچے کہیں مسلمان نہ ہو جائیں۔ چنانچہ کفار نے ابن دغنہ کو ان کا اپنا قول و قرار یاد دلایا۔ لیکن حضرت ابو بکر نے فرمایا۔ "اب میں تمہاری ہمسائیگی سے اللہ کی ہمسائیگی میں جاتا ہوں" خدا نے بھی ان کی یہ آرزو بہت جلد پوری کر دی اور چند ہی دنوں کے بعد ہجرت نبوی کا واقعہ پیش آ گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قوتِ احتساب اور روحانی اثر کی تو خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تصدیق فرمائی۔ جب چند عورتوں نے آنحضرت کے سامنے ذرا بیباکی سے گفتگو کی اور آنحضرت کے رفق و ملاطفت نے بھی اس کو گوارا کر لیا۔ تو یہ حضرت عمر ہی کی ہیبت تھی جس نے ان کو پردے کی آڑ میں چھپا دیا تھا۔ اور اس موقع پر نبوت کی زبان نے حضرت عمر کی اس روحانی قوتِ احتساب کا اعلان کیا تھا۔

ما یلقاک الشیطان سالکا فجا الا سلک فجا غیر فجک (بخاری جز ۵)	ہمیشہ شیطان تمہاری راہ سے بچ کے چلے گا۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر ابوایوب انصاری کو دعوت دی، وہ آئے تو دیوار پر ایک منقش و مصوّر پردہ لگا ہوا تھا۔ حضرت ابن عمر نے معذرت کی کہ عورتوں نے ایسا کیا ہے" لیکن انہوں نے دعوت کو رد کر اور اٹھ کر چلے آئے۔

فرضِ احتساب کا دائرہ صحابہ ہی تک محدود نہ تھا بلکہ جو لوگ ان کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ وہ بھی نہایت آزادی کے ساتھ اس فرض کو ادا کرتے تھے، اور خود صحابہ کو ٹوکتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبرزہ اسلمی گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور اتر کر نماز پڑھنے لگے، گھوڑا بھاگا، انہوں نے نماز چھوڑ کر اس کا تعاقب کیا اور پکڑ لائے، پھر نماز پوری کی، ایک شخص نے دیکھا تو کہا: "اس بڈھے کی اس جرأت کو دیکھئے کہ گھوڑے کے پکڑنے کے لئے نماز چھوڑ دی" انہوں نے کہا: "جب سے آنحضرت کا ساتھ چھوٹا کسی نے مجھ کو ملامت نہیں کی تھی۔ میرا گھر بہت دور ہے، اگر گھوڑا بھاگ جاتا تو میں شام تک گھر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں آنحضرت کی آسانیاں دیکھ چکا ہوں۔
(بخاری جزء ۸)

ختم شد